حیات کا رقص

(کہانیاں)

وسیم عباس

کتاب کا نام : "حیات کا رقص"
(کہانیاں)
مصنف : وسیم عباس

تاریخِ اشاعت : ۳ / اگسٹ ۱۹۹۸ء مطابق ۹ / ربیع الثانی ۱۴۱۹ ھ
تعداد : پانچ سو
قیمت : ستر روپے (Rs. 70/-)
(امریکہ دس ڈالر ، عرب ممالک پندرہ ریال)
کمپیوٹر کمپوزنگ : جے - جے - کمپیوٹرس Ph : 3516240
" کنج فاطمہ " 12-2-822/4/1 # مہدی پٹنم ، حیدرآباد - ۲۸ (انڈیا)
طباعت : او - ایس - گرافکس ، نارائن گوڑہ ، حیدرآباد -

کتاب ملنے کے پتے

302 ماؤنٹ سنتوشی اپارٹمنٹس ، میوری مارگ ، بیگم پیٹ ، حیدرآباد - (انڈیا)
" ادارہ ادبیاتِ اردو " ایوانِ اردو ، پنجہ گٹہ ، حیدرآباد - (انڈیا)
حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان ، حیدرآباد -

SYED A . ABBAS
29018 WALTHAM St, SPRING, TX 77386 - 2464. (U.S.A)

○●○

یہ کتاب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے جزوی تعاون سے شائع ہوئی ہے -

"میری شریکِ حیات سکینہ کے نام"

جس کی وجہ سے میں زندہ ہوں

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامران ہو کوہکن کی جیت ہو۔

(مخدومؔ)

میں کہانی دکھانا چاہتا ہوں

ترتیب

○●○

اقبال متین

"بساطِ رقص"

وسیم عباس کو پڑھ کر پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ فارمولے کا افسانہ نگار نہیں ہے، یا یوں سمجھیے کہ اس کے پاس افسانے کا کوئی فارمولا نہیں ہے۔

فارمولے سے آگہی کے باوجود جدیدی جدیدیت کے نوزائندہ اور غیر منطقی قیاس کے سبب اس کی شکست و ریخت بھی اس کو گزند پہنچاتی رہی ہے اور افسانے کی مروجہ خصوصیات تک مجروح ہوتی رہی ہیں۔

یہ بات بنیادی طور پر میرے نزدیک طے شدہ ہے کہ افسانہ ایک بیانیہ صنف ہے اور جب ماجرا سازی کا سلیقہ اس میں شامل ہوجاتا ہے اور اظہار کا اسلوبیاتی طرزِ بیان زبان کے برتنے سے لفظیات کے سہارے قدرت پاجاتا ہے تو افسانہ تخلیقی فن پارے کا جواز پیدا کرلیتا ہے۔

پلاٹ اور کردار سے کوئی منفی رویہ وسیم کے پاس نہیں ہے۔ وہ اپنے افسانے کا ظاہری چولا بدلے بغیر اس کے پہناوے میں کتر بیونت

کیے بغیر ایسے صراطِ مستقیم پر گام زن ہے کہ ماجرا سازی کے خارجی عوامل اس کے قلم کی زد میں آکر اکھرے ہوگئے ہیں ۔ یہ کہانی کے لیے کوئی مستحسن اقدام نہیں ہے اس لیے کہ اس کی گیرائی اس اکھرے پن سے مجروح ہوتی ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ ایسے میں بھی وسیم عباس کے افسانوں کو کبھی زندگی کی بوقلمونی حقیقت کی گراں جانی سے آگہی اور وابستگی عطا کرتی ہے ۔ کبھی کنارہ کشی یہی شاید اس کے افسانے کی سادہ لباسی کا حاصل ہے ۔

وسیم عباس کا ہنر بیانیہ کی پیوند کاری کا ہنر ہے ۔ ایک ایسا پیچ ورک (PATCH WORK) جو کبھی منظر کشی اور جزئیات نگاری کے بوتے پر بار پاتا ہے ، کبھی راہ میں گم ہوجاتا ہے ۔

حیات کا رقص کی پہلی ہی کہانی " ہونی ان ہونی " میں موت جو رشتوں کو منقطع کرتی ہے " جیک " اور " اسلم " کے رشتے کو استوار کردیتی ہے جو تصادم و تضاد کی اچھی مثال ہے ۔ موت کا زندگی پاجانا اتنا آسان نہیں ہے ۔ مذہب اور اس انسان کی دوستی پھر بنیاد پرست درندگی ۔ معاشرے کی منفی اور مثبت اقدار ، محبت اور اس کا جذبہ ، ایثار ، ہوس گری اور اس کا استحصال سارے جذبے اور وتیرے موت اپنے ساتھ لے جاتی ہے ۔ ساری حقیقتوں پر پردہ ڈال دیتی ہے لیکن اسلم جب جیک کو اپنے مردہ پیکرِ خاکی میں بسا لیتا ہے اور جیک ، اسلم میں رہ بس کر دل کی طرح دھڑکنے لگتا ہے تو فطرت پر آدمی زاد کے تعقل کی فتح کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا ۔ قدرت عاجز اس لیے نہیں ہے کہ موت ہی اس کا ایک

حربہ ہے ۔ سرجیکل سائنس کی برتری نے وقتی طور پر سہی جب قدرت کو زیر کرلیا تو اللہ میاں کو بھی آدم کی اولاد پر پیار آیا ہوگا ۔ یسوع مسیح صلیب پر پھر ایک بار مسکراتے ہوں گے ۔ یہ منظر وسیم بڑی چابک دستی سے یوں بتلاتا ہے کہ آنکھیں نم نہیں ہوتیں پھیل جاتی ہیں ۔ اب اگر منظر کشی میں کچھ یوں ہو کہ گرتی ہوئی اور سڑکوں پر جمتی ہوئی برف پر رینگتی ہوئی گاڑیوں کے ساتھ ہی ہاسپٹل میں اسٹریچر پر موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا دو ذی روح بدن آپریشن تھیٹر کی طرف اس طرح لے جائے جاتے ہیں جیسے موت زندگی میں داخل ہورہی ہو لیکن آپریشن تھیٹر تک پہنچ کر موت جھجکنے لگتی ہے ۔ وسیم کی فن کارانہ منظر نگاری یہاں داد طلب ہے ۔

وسیم کہانی دکھانا چاہیں یا سنانا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ بکی روشنائی میں کہانی جب ورق ورق پڑھی جاتی ہے تو اس کی راست وابستگی آنکھوں سے ہوجاتی ہے ۔ لیکن آپ کی آنکھوں کے سامنے الفاظ جس منظر کی تجسیم کرتے ہیں وہ منظر نکھر کر سامنے آجاتا ہے تو وہی آپ کی تصویر کشی کی مہارت ہے ۔ لیکن کیا ان الفاظ کی معنوی تہہ داری آپ کی نظروں سے اوجھل ہوکر آپ کے احساس کو لفظ لفظ اپنے ساتھ لیے لیے نہیں پھرتی اور لفظیات کی گراں جانی پاؤں دبا کر اپنی مدھم مدھم چاپ کے ساتھ آپ کے سینے میں اتر کر دل کی دھڑکن نہیں بن جاتی ۔ الفاظ جو آپ کا میڈیا ہیں آنکھوں کے آگے بکھرے ہوئے رہ کر ہی تو یہ عمل کرتے ہیں ۔ ایسے میں کہانی خود اپنے کو دکھاتی بھی ہے سناتی بھی ہے ایسے میں خود

آپ اس کے ساتھ بھی نہیں ہوتے اور مزہ یہ ہے کہ جب آپ اس کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو اس کی اندرونی کیفیات کو سن رہے ہوتے ہیں اور جب سنتے ہیں تو سننے کا یہ عمل ان لفظیات کے ہی تابع رہتا ہے جو آواز کو جسم عطا کرتی ہیں جسے آپ دیکھنے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی وسیم عباس کی ماجرا سازی میں گیرائی کا فقدان قاری کی ذہنی تسخیر کرتے کرتے چوک بھی جاتا ہے اور اس کو گرفت میں لے کر اس کے ذہن کا حصہ تا دیر نہیں بن پاتا۔ وسیم کے افسانوی کرداروں کو اپنی نوعمری کی جس منزل میں ہونٹوں کا رس پینے کا چسکا رہا ہوگا ان کی آنکھوں نے شاید یہ نہیں دیکھا کہ:

تو بھی اس کے ہونٹوں کا رس پی جاتا
لیکن اس کے ہونٹ ہی بے رس بے رس تھے

یہیں سے زندگی کے سمندر میں ایک ایسی کرب ناک بپھری ہوئی لہر اٹھتی ہے جو سمندر کو اتھل پتھل کر سکتی ہے اور اسی جذب دروں کو افسانے کا بیانیہ تہہ دار بناتا ہے اور وہاں لے جاتا ہے جہاں وسیم کے دکھائے ہوئے منظر نامے میں اور کئی منظر چھپتے اور جھانکتے ہیں۔

وسیم عباس کو گرجا کے گھنٹوں سے انس ہے۔ اس انسیت کے پیچھے اس کا بچپن لڑکپن، نوجوانی حصار بنائے ہوئے ہیں۔ اس کی مغربی زندگی سے آشنائی اس انس کو مزید استقامت عطا کرتی ہے اور اس کی

فطرت کا جز بن جاتی ہے ۔ وسیم چوں کہ اسلام سے بے بہرہ نہیں ہے اور اس کے تقدس کو دل میں بسائے ہوئے بھی ہے اس لیے وہ مذاہب کے درمیان انسانی وسیلے سے راستے تلاش کرتا ہے ۔ وہ مذاہب کی وسعتوں کا قائل ہے ، حد بندیوں کا نہیں ۔ اس کے نزدیک انسانیت کے احترام کی حد تک مذہب کی تقدیس برگزیدہ ہے ۔ ایسے لوگ جو انسانیت میں تقسیم کے لیے مذاہب کو آلہ ء کار بناتے ہیں انھیں وسیم برداشت نہیں کرتا ۔ وہ جذبہ ء محبت کا اثاثہ بردار ہے ۔ زندگی کے اس سامانِ سفر کو اس کی منزل تک پہنچانے میں کوئی دیوار حائل ہوجاتی ہے تو وسیم اسے گرا دینا پسند کرتا ہے خواہ یہ دیوار معاشرے کی ہو ، جغرافیائی عصبیت کی ہو یا مذہب کی اجارہ داری کی ۔ اس لیے وہ اس کی پسندیدہ کہانی " صلیب ایک نشانی " میں ریٹا کی محرومیوں کو اپنے احساسات کی جراحتوں میں چھپاتا رہتا ہے اور جب ریاض ملک اس کے بلاوے پر اپنے وطن لوٹتا ہے اور ہاسپٹل سے ہوتا ہوا گریو یارڈ پہنچتا ہے تو ریاض ملک کو اس کا دوست آنسو بہاتا ہوا صلیب کے پاس ملتا ہے وہ کون ہوسکتا ہے سوائے وسیم کے ۔ یہاں وسیم نے اپنے " میں " کو بڑے سلیقے سے چھپا رکھا ہے ۔

وسیم اپنی کہانیوں کے بیانیہ کو اکہرے پن سے بچا سکے تو رپورٹنگ کے انداز سے بچ سکتا ہے ۔ کہانی میں صرف دل چسپی کا برقرار رہنا کہانی کو خواندگی پذیر (READABLE) تو بنا دیتا ہے لیکن یہ خدشہ دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں ادب ، صحافت کا لبادہ نہ اوڑھ لے ۔ فلمی دنیا کے منظر نامے کا اندازِ تحریر وسیم کے قلم پر شاید اس حد تک

حاوی ہوگیا ہے کہ وہ اپنے بے ریا اعترافات کو اپنی طبعی حق گوئی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ایسی خود احتسابی کو اپنی زندگی کا شعار بنالینا اور برملا اس کا اظہار بہ بانگِ دہل کرنا بڑے ظرف کی بات ہے۔

وسیم کے افسانے " زندگی کی کتاب " میں عرفان سے قاری کو ایک فطری لگاؤ سا پیدا ہوجاتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ بھی ہوکہ قاری عرفان کی صورت میں وسیم کو پنہاں پنہاں دیکھنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ مرحوم طاہرہ بھابی اور اللہ رکھے سکینہ بھابی، رعنا اور شبانہ کا روپ دھار لیتی ہیں۔ حقیقت کو افسانے کا رنگ دے کر خود کو اپنی نجی زندگی کی نجابتوں کے ساتھ قاری کے حوالے کردینا اور خود تماشائی بن کر رہ جانا گویا تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے مترادف ہے اور وسیم فقیروں کا بھیس بناکر جذبہ ء محبت کی فتح پر شاداں و مطمئن نظر آتا ہے۔ چناں چہ اس افسانے کا اختتام وہ بڑی ہنر مندی سے کرتا ہے۔ جب فراق و ہجر کی تنہائیوں کا سارا کرب وجود میں اترے ہوئے سارے اندھیرے شبانہ کو روشنی کا استعارہ بنالیتے ہیں اور عرفان بڑھتے ہوئے سارے اندھیروں کو بجلی کا سوئچ دباکر منور کر دیتا ہے تو کہانی کے اس اختتام کا نازک اور بلیغ اشارہ اب اس کے بعد ایک جملے کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں سبھی گرجا گھر کے گھنٹے اور وقت کی طنابیں وسیم کے تخیّلہ کو اپناتے ہوئے ہیں۔

وسیم عباس نے اپنی کہانیوں کے بارے میں اپنی آپ بیتی بیان کر کے " میں اور میری کہانیاں " میں پہلے ہی واحد متکلم کا جواز پیدا

کر رکھا ہے اور کئی کہانیوں کے کرداروں میں چھپ گیا ہے ۔ " حیات کا رقص " کے تعلق سے تو اس کے اعترافات مزید کسی وضاحت کی گنجائش ہی نہیں رکھتے ۔

" اتفاق " ایک "FANTASIA" ہے جو صرف واہمہ پر مبنی ہوسکتا ہے ۔ وسیم عباس نے " میں اور میری کہانیاں " میں اس کے تخلیقی جواز پر کوئی روشنی ڈالنے سے گریز کیا ہے ۔ "FANTASY" زندگی سے میل نہیں کھاتی اور محسوسات کی مبالغہ آرائی کے ذریعے بہت آگے نکل جاتی ہے لیکن و تمسخر اور طنز کی حد تک اپنے ڈانڈے حقائق سے مربوط بھی رکھتی ہے محیرالعقول قیاس آرائی کا احاطہ کر کے جب کہانی کار اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کو اس کی ملازمت پر اس کی تعیناتی کے مقام پر پہنچاتا ہے تو یہ کہانی کردار کو بھوت پریت کا انسانی پیکر تو دے دیتی ہے چناں چہ چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اس کے باوجود صرف صورت کی مماثلت سے ایک ایسی تحیّر زا کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ پوٹر قندیل کی روشنی میں نئے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کا چہرہ دیکھتا ہے پھر دیوار پر ٹنگی تصویر کو دیکھتا ہے جو ہو بہ ہو پرانے اسسٹنٹ ماسٹر کی ہے ۔ خوف سے قندیل اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔ ایسی کہانی میں عام قاری کی دل چسپی کا برقرار رہنا کوئی اچنبے کی بات نہیں ہے ۔ گمان گزرتا ہے کہ وسیم عباس کے فلم کی منظر نگاری کے چسکے نے اس "FANTASY" کو جنم دیا ہے وگا اور انھوں نے اپنے ادعا کے جواز میں کہ وہ کہانی دکھاتے ہیں پوٹر کو قندیل کی روشنی میں کہانی

دکھا دی ہوگی اور کیا چاہیے کہ اس طرح قاری بھی کہانی دیکھ لیتا ہے۔ ویسے "FANTASY" قیاس و احساس کی تجسیم ہی کرتی ہے۔

"گھنٹے بجتے رہے" میں رمیش اور رنجنا کی محبت پر اقدار کی نصرت نے ایسا طمانچہ رسید کیا ہے کہ عاشقِ نامراد کی بدھی سیدھی ہوجاتی ہے۔ رنجنا جب یہ جان جاتی ہے کہ رمیش کی امپورٹڈ کار جو اس کے تموّل کی علامت بن گئی ہے دراصل نشانی ہے انسانی جانوں سے کھیلنے والی نقلی ادویہ کے کاروبار کی تو رمیش سے رنجنا کی باضمیری اپنا انس قائم نہیں رکھ سکتی اور وہ اس سے ٹوٹ کر ڈاکٹر راج کی ہوجاتی ہے۔ اس کہانی میں محبت کا کوئی ایسا افلاطونی تصور کارفرما نہیں ہے جو عواقب و عوامل سے کٹ کر پروان چڑھ سکتا ہو۔ "آنکھ موند کر دھیان" والی کیفیت نہیں ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر راج انجنا کو اپنے مردانہ حسن کے بوتے پر رمیش سے چھین نہیں لیتا بلکہ رنجنا اور راج کی ذہنی رفاقت شعور کی سطح پر وابستگی، نیک و بد کی جنگ میں نیکی کی فتح بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار چوں کہ گرجے کے گھنٹوں کو اپنے ذہنی ورثے کے طور پر ساتھ رکھتا ہے اس لیے پھر کہانی کی تان وہیں جاکر ٹوٹتی ہے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا کے مصداق۔ رمیش کے پتا جی مہندر ناتھ کی چتا کی دہکتی آگ اور بجتے ہوئے گرجے کے گھنٹے شام کے اندوہ و الم کو اور گمبھیر بنادیتے ہیں۔

وسیم عباس کے اکثر افسانوی کرداروں کو سہل پسندانِ رموزِ عشق کی طرح حیات کی میعادِ معہود سے کسی طرح شتابی سے گزر جانا ہوتا ہے اور دل کی بیماری سے وقوعِ موت اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ

پلک جھپکاتے جھپکاتے زندگی تہس نہس ہوکر رہ جاتی ہے اور عورت کے پیار سے لے کر دولت کے پیار تک سارے امکانات تلخیِ جاں کی حقیقت بن کر ناگہاں موت کے پردے میں چھپ جاتے ہیں اور افسانہ نگار بھی آسانی سے افسانے کے رموز کو نظر انداز کرسکتا ہے۔

وسیم عباس کی کہانیوں میں محبت حاصلِ زندگی بن کر ابھرتی ہے اور اس محبت کا تعلق زیادہ تر جنس زدہ ہے جو معاشرے میں اپنی تہذیبِ نفس کے بوتے پر باوقار بن کر سنورتا ہے۔ محبت میں گوشت پوست کا یہ ہیجان نہ ہو تو محبت کی اصلیت میں فرق پڑتا ہے لیکن وسیم عباس اس کی تقدیس کی باتیں اس حد تک کرتا ہے کہ اس کے پروردہ کردار بھی اس کی سادہ لوحی پر ہنستے ہوں گے۔ غالباً اس تہذیب نفس کا نام ہی اس کے پاس تقدیس ہے ورنہ محبت قرآن خوانی نہیں سکھاتی۔ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بےچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

تو ریوتی شرن شرما نے جواب میں پوچھا تھا کہ عورت نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے اعصاب پر سوار رہیں گے۔

اہمیت ہاتھی گھوڑوں کے سواری کرنے کی نہیں ہے اگر آپ شرما کی طرح اس کے مضحک پہلو کو لائقِ اعتنا سمجھیں۔ سوال یہ ہے کہ

زندگی سے مجادلہ کرنے میں صرف عورت ہتیار بنائی جائے تو مجنوں کی دشت نوردی زندگی کا سانحہ بن کر ابھرتی ہے اور یہی حاصلِ زندگی ہو سکتی ہے ۔ فرہاد کی کوہ کنی جادہ عشق کی آخری سبیل تو قرار دی جاسکتی ہے لیکن منزل نہیں ہونے پاتی اور مجنوں و فرہاد کے اس قبیلے سے کوئی اقبال پیدا نہیں ہوسکتا ۔ دل میں لاکھ عورت کا جمال اور محبت بسائے رکھیے لیکن اس کو کیا ۔ کیجیے کہ زندگی اس کے جمالیاتی احساس ہی کو ہاتھی گھوڑوں کے پیروں تلے روند کر رکھ دیتی ہے ۔ زندگی اسی بوقلموں محشرِ دار و گیر سے ۔ رنگا رنگ کائنات کی ایسی بے سروسامانی سے ایک اور بھی منظر پیدا ہوتا ہے جو محبت کو آفاقی اقدار سے روشناس کرتا ہے ۔ اقبال محبتوں کے منکر ہرگز نہیں ہیں اس کی بے پناہ وسعتوں کے متلاشی ہیں ۔

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانہ ء دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانہ ء دل

" حیات کا رقص " میں بھی رعنا کو کھو دینے کے بعد تنہا تنہا اداس اداس عرفان ، شبانہ میں زندگی کی چلت پھرت پاجاتا ہے اور اس طرح اس کا زندگی میں شمولیت کا خواب پورا ہوجاتا ہے اس خواب کو تعبیر

تک پہنچانے میں شبانہ کی سریلی آواز کا جادو کارفرما ہے جو محبت کا وسیلہ ہے۔
" اور چراغ جلتے رہے " بھی نچلے طبقے کے دو بھائی بہن کی زندگی ایک تاڑی کے کمپاؤنڈ کے اطراف گھومتی ہے اور ان کا لڑکپن آسودہ ہے لیکن منسا کی بہن چمپا جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہے تو مسائل جنم لینے لگتے ہیں اور پان کی دوکان والے شرفومیاں اپنی گھاگ صفت پوشیدگی کو جب چمپا کے منگیتر رامو پر نشے کی دھن میں عیاں کر بیٹھتے ہیں تو ہاتھا پائی اور دھول دھپے سے ان کی تواضع ہوتی ہے اور وہ کچھ عمر کچھ تہی دستی کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس قماش کے لیل و نہار سے کنارہ کشی تو اختیار کرلیتے ہیں کیوں کہ مولی اپنے ہی پتوں بھاری تھی کہ ایسے میں گھر کی دیوار پر ٹنگا آئینہ ان کی ہیت کدائی کو جس میں زلفیں اور داڑھی بھی شامل ہوگئی تھی مذہب کی ایک ایسی کاروباری چادر اڑھا دیتا ہے کہ شرفومیاں اب مولوی شرف الدین کی نقاب اوڑھ کر اپنی دوکان چند آیتوں اور وظیفوں کے سہارے چمکا لیتے ہیں لیکن اب بھی ان کی ہوس ناکی کی پروردہ چمپا ذہن سے نہیں ہٹتی یہاں تک کہ اس کی رامو سے شادی ہوجاتی ہے اور افسانہ نگار کو چراغوں کے جلتے رہنے پر تاسف نہیں ہوتا۔

وسیم عباس زندگی سے زیادہ زندگی کے اتفاقیہ اتمام و احتمال کا دل دادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے وقوع اس کی نظروں میں اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اور وہ ان کی اہمیت کا جواز اپنے اظہار میں تلاش کر لیتا ہے۔
" کرب " وسیم کی دوسری کہانیوں کے مزاج سے ہٹی ہوئی ڈرامائی کہانی ہے۔ ایسی باتیں جن کے امکانات اس دورِ نفسانفسی میں کم

ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ اپنی کہانیوں میں روا رکھتا ہے ۔ چاند کی چندر بن جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ معاشرے پر مذہب ، اس طرح اثر انداز نہیں ہوتا جس طرح نکبت کی تنگ دامنی اثر دکھاتی ہے ۔ راستہ کوئی ہو اللہ سے ملاتا ہو یا بھگوان سے ، کسی راستے کو متعین کرنے کے لیے پہلے روٹی کی ضرورت ہے جو سارے تعینات پر حاوی ہے ۔ مولوی صاحب کے گھر پرورش پانے والا مسلمان ماں باپ کا ایسا بچہ جو باپ کی زندگی میں بھی یتیمی کا درد سہہ رہا ہے کھیلتے کھیلتے مورتیاں بنانے والے چھوٹے سے کارخانے کا رسیا ہوجاتا ہے اور مورتیاں بنانے لگتا ہے لیکن مولوی صاحب کی اسلامی غیرت اس کو گوارہ نہیں کرتی لہٰذا مولوی صاحب کی غیر انسانی سرزنش سے دل برداشتہ ہوکر چاند ماں کو مولوی صاحب کے گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔ یہاں اس کی دست گیری کا فرض وسیم ایک ایسی عورت کو سونپ دیتا ہے جو ہندو بھی ہے اور عزت نفس کو نیلام پر اٹھا چکی ہے اور سیٹھ دھرم داس کی داشتہ ہے ایک بے سوا عورت کے دل میں جب ممتا کی کرن پھوٹتی ہے تو شاید اپنی بے چین کوکھ سے برانگیختہ ہوکر عورت پن سے زیادہ قریب ہوجاتی ہے ۔ چناں چہ کویتا چاند کو جو ، اب چندر ہے ، ممتا سے شرابور کردیتی ہے لیکن ایک دن چندر کے ایک سوال پر کہ وہ ہر رات اس کو تنہا چھوڑ کر کہاں گزارتی ہے ؟ ۔ ۔ ۔ کویتا اپنی دریدہ انا کو جس کے پرنچے اڑتے ہوئے اس نے ہزار بار محسوس کیا ہے سمیٹ کر سہن نہیں کرپاتی اور ایک طمانچہ چندر کے گال پر جڑ دیتی ہے ۔ چندر چھوٹی عمر میں بھی غیر معمولی حساس لگتا ہے ۔ وہ ہر

ظلم کے خلاف صرف اتنا ہی احتجاج کرسکتا ہے کہ راہ فرار اختیار کی جائے۔ حالات سے اس کی یہ فراریت ہی زندگی میں اس کی جڑیں پیوست کرتی رہتی ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ کر مورتیوں کے کارخانے میں پھر چاند بن جاتا ہے۔ یہ بلیغ اشارہ کہانی کو استعاراتی حسن سے گزار کر گیرائی عطا کرتا ہے اور یہ سلسلہ وہاں تک چلتا ہے جب حادثاتی طور پر چاند کویتا کی چتا میں بیٹے کی حیثیت سے آگ لگاتا ہے۔

ایک بات اور بھی ہے جس کا کہانی سے کوئی موضوعاتی علاقہ نہیں لیکن اس کے عنوان سے میری ذاتی وابستگی کچھ اس طرح ہوگئی ہے کہ میں اس کرب میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ آج میں کھلے دل سے اس دکھ کا اعتراف کرلوں وسیم عباس کا ممنون ہوں کہ اس نے اپنی کہانی کے عنوان سے میرے احساس کو آواز دی۔

میں نے اس شخصیت کے خلاف لکھا ہے جس سے آج تک میری کوئی ذاتی پرخاش نہیں رہی۔ میں نے اس شخص کے خلاف لکھا ہے جس نے اپنے ماہنامے میں اس کے اجرا سے لے کر آج تک میری تخلیقات کو محبت و اہتمام سے چھاپا ہے۔ خود اپنے ہی رسالے میں میرے اور اپنے نظریاتی اختلافات کے تعلق سے چھوٹے بڑے خطوط اپنے ہی ماہ نامے میں شائع کیے ہیں۔

ادبی نظریاتی اختلافات ادب میں توانائی کی دلیل ہیں۔ لیکن ادب جب ذاتیات پر اتر آتا ہے تو گراوٹ کا شکار ہوجاتا ہے اور ادب نہیں رہتا۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے ادبی مجادلے میں بہت سی دل

آزاری کی باتیں روا رکھی گئی ہیں ۔ ایک دوسرے جت ذاتیات پر حملے ہوئے ہیں ۔ سب کچھ بجا لیکن میرا اس شخص سے کیا تفرقہ ہے ۔ میں نے بھی یہ ریشہ دوانائیاں پڑھی ہیں اس نے بھی ۔

مجھے تو صرف اس ایک پتھر کا جواب دینا تھا جو مجھ پر بے قصور پھینکا گیا تھا میں نے جواب میں اس شخص کی دل آزاری حد سے تجاوز کرتے ہوئے کی ہے جس کے خوشہ چینوں میں مجھے سنگسار کرنے والا سورما بھی تھا اور صرف یہ بتانے کے لیے کی ہوگی کہ میں تو عقلِ کل سے بھی یہ سلوک کرسکتا ہوں ۔ کیوں کہ جناب وہ دن بھی یاد ہیں جب آپ ایک نامور اور اہم ترقی پسند افسانہ نگار کے پیچھے علی گڑھ میں حضورِ والا ، حضورِ والا کی رٹ لگائے پھرتے تھے ۔

میں نے جس کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے اس کے اعتراف میں وسیم عباس کے خلوص سے میری صرف اتنی گزارش ہے کہ اگر میری آنکھ بند بھی ہوجائیں تو ، رفعت صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ " ہیرے کا جگر " اور اپنے افسانوں کا مجموعہ " حیات کا رقص " کی ایک ایک جلد شمس الرحمٰن فاروقی کو بھجوادیں اور لکھیں کہ یہ اقبال متین کی تمنا تھی ۔

اقبال متین
"کہانی" کتاب نگر ، نظام آباد ۔
اے ۔ پی 503001

۷ / جنوری ۱۹۹۸ ء

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

دو باتیں "حیات کا رقص" کے متعلق

"حیات کا رقص" وسیم عباس کی (۱۱) کہانیوں کا "وسیم" (خوب صورت) مجموعہ ہے اور "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" کی مصداق وسیم عباس نے خود اپنے پیش لفظ "میں اور میری کہانیاں" میں نہ صرف اپنی کہانی بیان کی ہے بلکہ ان کہانیوں کے پیچھے پوشیدہ راز کا بھی افشا کردیا ہے۔ خود ان کی زندگی، ان کے اچھے برے تجربے، ان کے طرب و کرب ہی ان کی کہانیوں کی بنیاد ہے۔

وسیم عباس کو گرجا گھر کے گھنٹوں سے خاص انس ہے اور ان گھنٹوں کے بجنے اور نہ بجنے دونوں ہی میں "رقصِ حیات" کا پرتو ملتا ہے۔ بلکہ غم و نشاط کا اظہار بھی ان ہی گھنٹوں کی آوازوں میں ملتا ہے۔

وسیم عباس کی کہانیوں میں دل کو چھو لینے والی بات یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ مذہب کی دیواروں میں ان کا انسان قید نہیں۔

" ہونی انہونی " میں اسلم مسلمان ہے قلب کو تبدیل کرنے پر جیک ایک حادثہ میں مرجاتا ہے ۔ اس کا قلب اسلم کے سینے میں دھڑکنے لگتا ہے ۔ گرجا گھر کے گھنٹے خاموش ہیں ۔ ایک عیسائی کا دل ایک مسلمان کے سینے میں منتقل ہوچکا ہے ۔

پھر " گھنٹے بجتے رہے " میں رمیش اور انجنا میں عشق ہے ۔ لیکن جب یہ پتا چلتا ہے کہ رمیش اپنے باپ مہندرناتھ کے دواؤں کے دھندے میں ملوث ہے ۔ خطرناک اور نقلی دوائیں بناتا اور بیچتا ہے اور پولیس کو اس ک پتا چل جاتا ہے تو انجنا اس سے انجان ہوجاتی ہے ڈاکٹر راج کی طرف راغب ہوجاتی ہے ۔ اتفاق دیکھیے کہ مہندر ناتھ کے قلب پر حملہ ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر راج علاج کرتے ہیں لیکن وہ بچ نہیں سکتا ۔ رمیش اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کرتا ہے اور پھر قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ پولیس نے رمیش کو اپنی گرفت میں لے لیا ۔

یہاں گرجا گھر کے گھنٹے بجتے رہے ۔ لیکن ان گھنٹوں کی آواز نہایت غمگین ہے اور یہ علامت ہے رمیش کے غم و اندوہ کی ۔

" صلیب ایک نشانی " میں ریٹا ایک ہوٹل کے ریسپشن میں ملازم ہے ۔ ریاض ملک کو اس سے عشق ہوجاتا ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کے ہوجاتے ہیں ۔ پھر ریٹا کو بچہ ہونے والا ہوتا ہے اور ریاض کام پر دوبئی چلاجاتا ہے ۔

ادھر ریٹا کو مردہ بچہ پیدا ہوتا ہے ۔ وہ بھی مرجاتی ہے اور ریاض آتا بھی تو ریٹا کے دفن ہوجانے کے بعد ۔

یہاں میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر " مردہ بچہ " کس بات کی علامت ہے اور میری دانست میں کہیں وہ اس " ہجر " کی علامت تو نہیں جو مجبور ریٹا پر مسلط ہوگیا تھا ؟

" اتفاق " بھی ایک چونکا دینے والی کہانی ہے اسٹیشن ماسٹر سے نیا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ملنے آتا ہے ۔ وہ ہو بہ ہو پرانے اسٹیشن ماسٹر جیسا ہے اور اس کی ڈائری پڑھ چکا ہے ۔ اسٹیشن ماسٹر کو اپنے ماضی کے درد و کرب یاد آتے ہیں ۔ بلکہ نئے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے یاد دلائے ہیں جو خود ایک اچنبھے کی بات ہے ۔

پھر پاسنجر ٹرین کے لیے راستہ صاف کرنے کے واسطے مال گاڑی ہٹانی تھی ۔ ڈرائیور کے قلب پر حملہ ہوتا ہے اور وہ وہیں ختم ہوجاتا ہے ۔ پھر گاڑی جوں توں ہٹائی جاتی ہے اور " آج یہ پاسنجر ٹرین صحیح وقت پر آرہی تھی ۔"

" زندگی کی کتاب " اور " حیات کا رقص " کردار وہی ہیں اور لگتا ہے آخر الذکر کہانی پہلی کہانی کا تسلسل ہے ۔

عرفان کو رعنا سے عشق ہوجاتا ہے ۔ دونوں ماں باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کرلیتے ہیں لیکن رعنا داغِ مفارقت دے جاتی ہے ۔ پہلی کہانی میں عرفان کی ملاقات شبانہ سے ہوتی ہے جو ایک بڑے ہوٹل میں رسپشن میں کام کرتی ہے ۔ دونوں میں میل جول بڑھ جاتا ہے ۔ عرفان کو بھی اسی کامپلکس میں ایک کمرے ملتا ہے ۔

پھر شبانہ اس کے " اندھیرے " کمرے میں آتی ہے اور کمرہ

" روشن ہوجاتا ہے ۔"

دوسری کہانی میں عرفان رعنا کی قبر پر غم کے آنسو بہاتا ہے ۔ قریب سے کوئی " آواز " آتی ہے ۔ بس یہ آواز اس کی مایوس زندگی میں ایک کرن کی طرح آتی ہے ۔ وہ اس کی تلاش کرتا ہے ۔ یہ شبانہ کی " آواز " ہے ۔ عرفان اور شبانہ ایک ہوجاتے ہیں ۔ یہ " رقصِ حیات " ہے ۔ " آواز ایک بہانہ بن جاتی ہے " محرومِ عشق " کو تجدیدِ عشق " کی طرف لوٹ آنے کا ۔

" اور چراغ جلتے رہے " میں شرفو میاں کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے ۔ تاڑی کے کمپونڈ کے پاس ان کی پان کی دکان ہے ۔ یہ اور راجو تاڑی بھی پیتے ہیں اور چمپا سے عشق بھی ۔ اس کا علم راجو کو ہوتا ہے تو وہ مارپیٹ پر اتر آتا ہے ۔ یہاں سے شرفو میاں کی زندگی میں موڑ آتا ہے اور وہ تاڑی اور عشق دونوں ہی کو " ترک " کر کے مولانا بن جاتے ہیں ۔

ایک روز " مولوی شرف الدین صاحب " کے کانوں میں شہنائی کی آواز پڑتی ہے ۔ دور سے نظر آتا ہے کہ چمپا دلہن بنی ہے اور راجو سے شادی ہورہی ہے ۔

" اور چراغ جلتے رہے " چراغ تو جلتے ہی رہیں گے ۔

" کرب " اصل میں شانو کے اور اس سے بڑھ کر کویتا کے کرب کا اظہار ہے اور کہانی ختم ہوتے ہوتے خود قاری کے کرب کا اظہار بن جاتی ہے ۔ شانو کی شادی اسلم سے ہوتی ہے لیکن ایک بچہ

ہونے کے بعد وہ غائب ہوجاتا ہے ۔ شانو ایک کٹر مذہبی حاجی صاحب کے گھر ملازم ہوجاتی ہے ۔ اور اس کا بچہ چاند بھی ساتھ ہے ۔ لیکن وہ پڑوس میں مورتیوں کے بنانے والوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے مورتیاں بنانے لگتا ہے ۔ حاجی صاحب اس " کافرانہ " حرکت کو برداشت نہیں کر پاتے اور اس کو طمانچہ مار دیتے ہیں ۔ وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے سڑک پر گرجاتا ہے ۔ کویتا اسے اپنی موٹر میں اٹھا لیتی اور گھر لے آتی ہے اب وہ کویتا کا بیٹا چندر بن جاتا ہے ۔

کویتا سیٹھ دھرم داس کی داشتہ ہے ۔ (یہاں سیٹھ کا نام دھرم داس خود ایک بڑا " طنز ہے ") ۔

ایک روز چندر کویتا سے کچھ پوچھ لیتا ہے ۔ اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ ایک طمانچہ رسید کردیتی ہے ۔ اب پھر چندر بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔ اب وہ مورتیاں بنانے کے کارخانے میں پہنچ جاتا ہے اور اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرلیتا ہے اور چندر سے چندو بن جاتا ہے ۔ ایک خوب صورت مورتی بناتا ہے جلوس نکلتا ہے ۔

اور ادھر سے کویتا کا جنازہ آتا ہے ۔

سیٹھ کا منیجر چندو کو پہچان لیتا ہے ۔ اور پھر ۔ ۔ ۔

چندو جنازہ کے ساتھ ہوجاتا ہے ۔ کویتا کو آگ دیتا ہے ۔ بیٹے کا کرب ناک فرض ۔

" برگد کے پتے " بھی ایک خوب صورت کہانی ہے ۔ راجی کی جھونپڑی ہے ۔ اس کے قریب ہی جنگل ہے اور اس میں برگد کا یہ پرانہ

درخت ہے ۔ اس سے المیہ اور طربیہ دونوں ہی قسم کے واقعات وابستہ ہیں ۔ لوگ اسے تلک لگاتے ہیں پرستش کرتے ہیں ۔ اور پھر ایک مورتی نصب ہوجاتی ہے ۔ اس کی پوجا ہونے لگتی ہے ۔

طوفان بادوباراں ایک عذاب کی طرح نازل ہوا ہے ۔ رامی پریشان ہے اس کا شوہر نہیں آیا ۔ شوہر پریشانی کے عالم میں دوڑتا ہوا جھونپڑی کی طرف آتا ہے ۔ گھور اندھیرا ہے اور طوفان کی خوفناکی ہے ۔

رامی بھی جھونپڑی سے نکل کر شوہر کی تلاش میں دوڑ رہی ہے ۔

ایسے میں بجلی چمکتی ہے ۔ رامی کو اس کا شوہر مقدس برگد کے قریب نظر آتا ہے ۔ وہ دوڑتی ہے ۔ گرجاتی ہے ۔ زخم سے خون رستا ہے اس سے برگد کو تلک لگاتی ہے ۔ اور بیوی شوہر مل جاتے ہیں ۔

یہاں برگد تو علامت ہے ہی " تحفظ " کی ۔ لیکن " بجلی کی چمک " بھی اہم ہے ۔

یاس کے اندھیرے میں آس کی کرن ۔

" بچہ بھوکا ہے " ایک بھکارن کی آواز پر بھیک کے لیے لیکن کہانی کے ختم ہوتے ہوتے یہ راز کھلتا ہے کہ ایک بڑھیا قریب کے دواخانے سے بچہ چرا لاتی ہے اور اس نوجوان عورت کے حوالے کر دیتی ہے ۔ وہ اس کو بھیک کا ذریعہ بناتی ہے ۔ اور پھر شام میں بڑھیا بچے کو اور بھیک دونوں ہی کو بٹوا لے جاتی ہے ۔

" سفید گاڑی " بھی اسی قسم کی کہانی ہے ۔ " سپنا نرسنگ ہوم " کی سفید گاڑی " میں بچوں کو راستوں سے اٹھا کر لے جاتے ہیں ۔ اس

بچے کو بھی لے جاتے ہیں ۔ لیکن جب گاڑی نرسنگ ہوم کے پاس رکتی ہے تو بچہ کود کر بھاگ نکلتا ہے ۔ چھپ جاتا ہے ۔ اور جب " سفید گاڑی " والے ڈھونڈھ کر تھک کر واپس ہوجاتے ہیں تو بچہ اسی موٹر کے پہیوں کے نشانات کے سہارے دوڑتا ہے اور پھر بے ہوش راستے میں گرپڑتا ہے ۔ ایک نوجوان جوڑا اپنے فارم سے کار میں لوٹتا ہوتا ہے ۔ وہ اس بچے کو اٹھالیتے ہیں ۔ کسی • ح اس کے اسکول کا پتا لگاتے ہیں اور پھر اسکول سے اس کے گھر کا پتا چلتا ہے ۔ وہ بچے کو ماں باپ کے حوالے کردیتے ہیں مگر بچہ گم سم ہے ۔ صرف " سفید گاڑی " کہتا ہے ۔

کچھ دنوں بعد اخبارات میں خبر پڑھنے کو ملی کہ " سپنا نرسنگ ہوم " کی " سفید گاڑی " بچوں کا اغوا کرتی ہے ۔ سفید گاڑی کے کالے کرتوت ۔

غرض ان کہانیوں میں عوامی زندگی کا درد و کرب بھی ملتا ہے اور اس کے خلاف انسان کی جدوجہد کے اشارے بھی ۔

راج بہادر گوڑ

حیدرآباد ۔
۱۱ / اکتوبر ۱۹۹۷ء

ذکی شاداب

"تاثرات"

وسیم (بھائی) عباس کی تخلیقات پر قلم اٹھاتا ہوں تو سکینہ بھابی (سکینہ وسیم عباس) کے افسانوں کا مجموعہ "صلیب کا بوجھ" کا خیال آگیا یعنی جو شرکِ جائز کا متقاضی ہے۔ غرض صلیب کے ساتھ وسیمی بوجھ۔۔ ۔۔۔ اس لیے کہ اس ذاتِ بزرگ کی آزاد خیالی جو قدرت کی دین بھی ہے، معاشرتی زاویے سے بوجھ بنتی رہی۔ مگر صلیبی اہمیت کو تسلیم کرنے سے زندگی کی تلخیوں کا بارِ گراں لیے عشق و محبت کے پیچ و خم کا سامنا کرتے ہوئے سفرِ حیات کو خوش گوار بنانے کا حوصلہ ان کی "حیات کا رقص" کا فکری پس منظر بن گیا۔ ان کے مزاج پر حضرت شائق حسین سفیر مرحوم[1] کا یہ شعر صادر آتا ہے:

---

[1] مرحوم کرنل زین العابدین کرنل (مقیم ملک پیٹ) کے والدِ بزرگوار

باتیں ناصح کی سنی یار کے نظارے کیے
آنکھیں جنت میں گئیں کان جہنم میں رہے

لازم ہے ان کی شخصیت کو نجی اعتبار سے پرکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا کیا عوامل تھے جو ان کی تخلیقات کے محرک بنے ۔ اس کے ساتھ کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو ادبی رنگ میں نمایاں نہ ہوئی ہوں مگر افسانہ نگار کے تعلق سے معلوماتی مواد فراہم کرتی ہیں ۔ اسی نوعیت کے مواد ادیبوں کے تعلق سے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کا خلوص اور بھولاپن ان کی وسیع النظری و روشن ضمیری ان کی شخصیت کا حصہ بنتے رہے ۔ کبھی انھوں نے بغاوتی رویہ اختیار کیا تو وہ بھی مؤدبانہ و بے ضرر ہے ۔ اس لئے کہ روایات کی پاس داری تھی ۔ کبھی تو والہانہ تقدس کے جذبے کے ساتھ قلندرانہ مزاج کارفرما اور رندانہ فطرت کے سبب سطحِ عرفاں پر کائنات کی اکائی کی پہچان ۔

اصل میں ان کے ذہن رسا کا پتہ اس دور ہی میں چل گیا تھا جب راقم الحروف جامعہ عثمانیہ کا طالب علم تھا ۔ اور یہاں لینڈ اسکیپ (LAND SCAPE) پر نظم بہ عنوان " جامعہ کا ایک منظر ـــ" لکھا تھا جس کو ۴۰ سال سے بڑھ کر گزر گئے ۔ جب جامعہ کے رنگیں ماحول میں رومانی تجربات اور حادثوں سے دوچار ہورہا تھا ایسے میں وسیم عباس صاحب ہم دم و دم ساز تھے ۔ غرض ایک طرف حسن پرستی و سوزِ دل دوسری طرف مادہ پرست دنیا سے بے زارگی اور سطحی ذہنوں کا ماتم ۔ یہ ایسی صداقتیں

تھیں جو شاعر کو وہ نظم لکھنے پر اکسا گئیں۔
چند شعر پیشِ خدمت ہیں :

جی جو گھبرائے مرا تجھ کو صدا دیتا ہوں میں
پردہ ء احساس میں تجھ کو چھپا لیتا ہوں میں

روٹھ کر دنیا سے تجھ کو یاد کر لیتا ہوں میں
دامنِ تخیل میں کچھ پھول بھر لیتا ہوں میں

تیرے جلوے رازِ ہستی کہہ کہ جو تڑپا گئے
زمزمے کچھ حافظہ وہ خیام کے یاد آ گئے

کم نظر دنیا پہ بس آنسو بہا کر رہ گیا
شاعر[1] فطرت رسا کے گیت گا کر رہ گیا

دور سے تیرا اشارہ اضطرابِ زندگی
تیرے آئینے میں عکسِ انقلابِ زندگی

اب یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ افسانہ نگار کے بعض اوصاف و

[1] ولیم ورڈس ورتھ۔

کردار ان سے نصف صدی سے بڑھ کر وابستہ رہے اور وہ بھی یوں جیسے ایک باوفا معشوق اپنے عاشق سے ۔ ان کی انفرادی فضیلت یہ ہے کہ متضاد کیفیتوں کا شکار بھی ہوئے تو مجنونانہ وابستگی یوں پیدا کرلی کہ لیلیٰ کی طرح خود کو بھی محمل نشینوں میں شامل کرلیا ۔ مگر ایسا بھی ہوتا آیا کہ کوئی خطرہ یا تصادم پایا تو شاطرانہ طریقے سے خود کو اپنے معشوق یا شریکِ سفر کے حوالے کردیا ۔ اور انجانے میں اطاعت گزاری کا شیوہ اختیار کرلیا ۔ ان پر کسی قسم کا احتساب کیوں کر بار نہ رہتا ۔

سپر دم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را
(میں نے اپنا سارا سرمایہ تجھے حاضر کردیا
اور تو ہی کمی یا زیادتی کا حساب جانے)

اب ان کے کچھ افسانوں کی طرف مائل ہوجاؤں ۔ ان کے دو افسانوں " حیات کا رقص " اور " زندگی کی کتاب " میں عرفان کا کردار غور طلب ہے ۔ اس کی شخصیت سازی میں اس کا دانشورانہ رجحان دخیل تھا ۔ وہ نطشے NIETZCHE آسکر وائلڈ OSCAR WILDE برٹرنڈ رسل BERTRAND RUSSELL فرائڈ FREUD کا مطالعہ کرتا رہا ۔ ان ادیبوں نے معاشرے کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف عنوانات پر روشنی ڈالی مثلاً روایتی اخلاقی نظام ، معاشرتی اقدار کا آزادانہ جائزہ ، فوق الابشری ، اقتدار اور قوت جبلی تقاضے ، تحت الشعور میں دبی ہوئی خواہشات کا ردِ عمل اور اس کا جوشِ اظہار وغیرہ وغیرہ ۔ المختصر عرفان کا ولولۂ شباب

اور عاشقانہ مزاج ان تبصروں کا مجموعی تاثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔
وہ احساسات میں ڈوبے زندگی کی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا افسانہ
نگار نے اس جوان سے نقادانہ جملہ کہلوایا کہ آوسکر وائلڈ بھٹکا بھی سکتا
ہے۔ جوانوں کے حلقے میں علمی گفتگو کے موقع پر عرفاں کی شخصیت کی
پہچان ہوتی ہے۔ پھر اس کی سوچ بچار کے تحت اک ردِ عمل جو گفتگو
میں تیزی بھی آگئی۔ یہ ماحول خود افسانہ نگار کے ایامِ جوانی کی عکاسی کرتا
ہے۔ مگر ایسے میں ایک نکتہ قابلِ تنقید ہے جس کی وضاحت موجودہ
مذہبی تصنوع سے پیدا شدہ حالات میں ضروری ہے۔ وہ لامذہب نہیں
ہے بلکہ سمجھ سکتا ہے کہ پیدائشی حادثہ کی بنا پر ہر فرد کی ایک خاص فرقے
سے شناخت ہوتی ہے۔ بنی نوعِ انسان کا ذاتوں کے خانوں میں بٹ جانا
اس کو متحیر کرتا ہے۔ اس کا کسی بھی عبادت گاہ کے تقدس کا لحاظ کرنا
خود ثابت کرتا ہے کہ وہ روحانی لگاؤ کا پاس کرتا ہے اور عالم گیر برادری کا
معتقد ہے:

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بدان آستان رود

دوسری طرف سے یہی ہم آہنگی کا جذبہ ہندستان کی تہذیبی ثقافتی بوقلمونی
کا طرہ ٔ امتیاز رہا ہے۔ ایسے ہی پہلوؤں کو زیرِ غور رکھتے ہوئے ادیب اپنے
سماج کی خوبیوں اور کمزوریوں خصوصاً آج کی بربادیوں کا جائزہ لیتا ہے۔
یہاں ہمارے آزاد وطن کے فرقہ وارآنہ شر انگیزوں پر تازیانہ ہے بلکہ

ملامت بھی۔

" برگد کے پتے " میں برگد کا درخت ایک تاریخی نشانی معلوم ہوتا ہے ایک زمانے میں راجو کا حویلی میں زیادہ وقت گزرتا تھالیکن کام کا بوجھ کم تھا۔ وقت کروٹ لیتا ہے تو اس کے برعکس ہوا۔ یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر جاگیر داری ختم ہونے پر صنعتی نظام کے رائج ہونے کے بعد ایک تبدیلی کی ترجمانی ہے۔

اس افسانے میں اور ایک نکتہ توجہ کا خواہاں ہے۔ برگد کے درخت کے زیرِ سایہ کیا کیا عقیدے پرورش پائے۔ بس ایک رنگین خواب کا تسلسل ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عالمِ غیب و خموشی میں اپنے عقیدت مندوں کی خود سے وابستگی کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے ایک وجود سے کئی چیزیں وجود میں آئیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ اس کے تعلق سے جداگانہ تصورات پائے گئے۔

اصل میں تاریخِ انسانی میں ایک ہی حقیقت کو مختلف زاویوں سے سمجھا گیا۔ راست گوئی کے ساتھ غلط بیانی و دروغ گوئی بھی جاری رہی۔ تضادات و اختلافات کی ایک داستان بنتی گئی۔ معلوماتی زخیرہ بڑھتا گیا اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ یہاں HISTORICISM تاریخیت کا ایک پہلو نمودار ہوتا ہے۔ اصل میں عالمِ انسانیت بہت پیچیدہ عناصر سے ظہور پذیر ہوتا آیا جو عمرانیاتی (SOCIOLOGICAL) رو سے ایک دقیق و وسیع مضمون ہے۔ مختصر یہ کہ عقلِ انسانی اپنے کرشمے دکھاتی گئی دریائے توہم بہتا چلا۔

اب مزید دو افسانوں پر اختصار سے تبصرہ کروں ۔ " بچہ بھوکا ہے " میں ایک مقامی تفریح گاہ (حیدرآباد کا باغِ عامہ) کے آس پاس بھکاریوں کی زندگی اور ان میں پوشیدہ چالبازیوں کا مشاہدہ ہے ۔

روز مرہ کی زندگی میں ایسے عنوان کوئی تعجب خیز نہیں مگر گہرائی سے مطالعہ کریں تو بہت کچھ تخریب کاری کا احاطہ کیا جاسکتا ہے جو خود متمول ممالک میں بھی (UNDER GROUND) درپردہ طرزِ حیات کا اہم عنصر ہے ۔

سفید گاڑی میں معصوموں اور نوجوانوں کے منصوبہ بند استحصال کا راز فاش ہوتا ہے ۔ رات دن پیش آنے والے دہشت آمیز واقعات کی تصویر کھینچی گئی ۔ اس گاڑی کے چلنے سے ہمارے ملکی نظام کی گراوٹ کی رفتار سے واقفیت ہوتی ہے ۔ یعنی کس چھپے ہوئے انداز میں مجرموں اور ظالموں کی ہمت افزائی ہوتی ہے جو تیزی اور بے باکی سے اپنے دھندوں میں مشغول ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ بےچارے عوام عبرت ناک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں ۔

اپنے تاثرات کے اختتام پر یہ عرض کروں گا کہ وسیم عباس اپنی شریکِ حیات کی طرح (جس کے " صلیب کا بوجھ " کے تاثر میں وضاحت کرچکا ہوں کہ) ہمارے موجودہ مسائل و کم زوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں ۔ اور خود کو ترقی پسند ظاہر کرنے ان گھسے پٹے موضوعات پر وقت ضائع نہیں کرتے جو آج کے دانش ور حلقوں میں ایک طریقہ ء فیشن بن گیا ہے ۔ وہ ماضی کی شاندار روایتوں کا خیرمقدم کرتے ہیں اور

انسانی بھائی چارگی کے دل و جان سے قائل ہیں ۔ ان کے ایمان میں مذہبی جزیوں نمایاں ہے کہ وہ کوئی بھی تعصب ، کم نظری اور اختلاف کو گناہ سمجھتے ہیں ۔

عملی دنیا میں ان کی جراء ت رندانہ اور بڑھ جائے تو ان کی شخصیت زیادتر ابھرے گی ۔

غرض ان کے ذوق و شوق اور ان کے عالم گیر اخلاقی اقدار پر ایقان کی جھلک ان کی افسانوی تخلیق میں جلوہ گر ہے ۔ مجھے مسرت ہے کہ صاحبِ موصوف کی دیرینہ کاوشوں کا کارواں منزل تک پہنچا ۔ میری تمنّا ہے کہ انھیں مزید علمی و ادبی منازل کا ادراک ہو ۔

ذکی شاداب

"میں اور میری کہانیاں"

میرا آبائی وطن تعلقہ بھونگیر ضلع نلگنڈہ (حیدرآباد اسٹیٹ) ہے۔ میرے والد مرحوم کا نام سید محمد باقر تھا۔ وہ جن خوبیوں کے مالک تھے ان کو ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ وہ نہایت ہم درد بڑے باحوصلہ اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ ناکامی یا ناامیدی جیسے لفظ ان کی ڈکشنری میں نہیں تھے۔ گتہ داری ان کا پیشہ تھا۔ وہ مجھے بے حد چاہتے تھے۔ ویسے سارے خاندان والے مجھے بہت چاہتے تھے کیوں کہ میں خاندان کا پہلا چشم و چراغ ہوں۔

میرے ننھیال کا تعلق بھی بھونگیر ہی سے ہے۔ میرا ننھیال زیادہ دنوں تک بھونگیر ہی میں قیام پذیر رہا۔ میرے نانا جناب مولوی فیض حسین صاحب قبلہ جن کا تخلص فردؔ تھا نہ صرف ایک نامی گرامی مولانا تھے بلکہ ایک جیدّ عالم اور اچھے مذہبی شاعر۔ انھوں نے کئی ایک مذہبی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ قصیدوں کا ایک مجموعہ "مخزن الجواہر" اور

نوحوں کا ایک مجموعہ " طومارِ درد " شائع ہوئے ہیں ۔ میں یہاں ایک بات کہنے سے گریز نہیں کروں گا کہ آج کے شاعر علامتی شاعری کو جدت سمجھتے ہیں جب کہ آج سے سو ، سوا سو سال پہلے میرے نانا نے علامتی شاعری کے طور پر پورا ایک نوحہ لکھا تھا ۔

نوحہ

بہارِ زخمِ تنِ شہیداں سماں یہ تازہ دکھا رہی ہے
چمن بھی ہر سو کھلا ہوا ہے مہک بھی پھولوں کی آ رہی ہے

پڑے ہوئے کس چمن کے ہیں گل کہ جن پہ سب رو رہے ہیں بلبل
کلی بھی ہر اک چٹک چٹک کر جراحتِ دل دکھا رہی ہے

کوئی گلِ تازہ ، چمن ہے کوئی کلی کوئی یاسمن ہے
کٹا ہوا سب باغ پڑا ہے ، خزاں گلِ داغ کھا رہی ہے

کئی ہیں غنچے جو خشک ہو کر ستم کی صرصر سے جھڑ گئے ہیں
ہے جاں گزا ان کی نامرادی کہ دل میں کانٹے چبھا رہی ہے

کہیں صنوبر کٹے ہوئے ہیں کہیں قلم سرو ہو گئے ہیں
جو خارِ دشت غم کھا رہا ہے تو نہر آنسو بہا رہی ہے

وہ پھول زیبا، وہ غنچہ رعنا، وہ سرو بالا، وہ گل، وہ لالہ
عجب چمن تھا کہ یاد اس کی جہاں کو اب تک رلا رہی ہے

ہے داغِ ماتم گلوں کے تن پر، ہر ایک نرگس کی چشم ہے تر
کہیں نسیمِ سحر ہے مضطر، کہیں صبا خاک اڑا رہی ہے

یہ کون محبوب قلب و جان ہے، یہ کون روحِ تن جہاں ہے
کہ جس کی فرقت سے انس و جن میں ہمیشہ آہ و بکا رہی ہے

ہے دن کو اندھیر ساری دنیا گہن ہے مہر فلک کو غم کا
ہے شب کو ماتم کی بزم برپا کہ شمع آنسو بہا رہی ہے

یہ ان کے ماتم کا مرتبہ ہے کہ اس سے خالی نہیں کوئی شئے
فلک سے بھی خون برس رہا ہے زمین بھی خاک اڑا رہی ہے

ہے کلک فردؔ حزیں بھی گریاں یہ پرُ اثر ہے غمِ شہیداں
وفورِ غم سے لکھا ہے نوحہ سرشکِ حسرت بہا رہی ہے

نوحے کا شعر: وہ پھول زیبا، وہ غنچہ رعنا، وہ سرو بالا، وہ گل وہ لالہ
عجب چمن تھا کہ یاد اس کی جہاں کو اب تک رلا رہی ہے
کو میں نے اپنی ایک کہانی "حیات کا رقص" میں استعمال کیا ہے۔

میری دادی جن کا نام شکر النساء بیگم اور جنھیں ہم سب بی جنّی پکارتے تھے اگر میں ان کا ذکر نہ کروں تو میری یہ روداد زندگی ادھوری رہ جائے گی میرے دادا کی شادی کم عمری میں ہوئی اور انتقال عہدِ جوانی میں ہوگیا۔ وہ اپنے پانچ لڑکے چھوڑ گئے ایک لڑکا نوجوانی میں ہی جان بہ حق ہوگیا۔ دوسرے چار لڑکوں کو میری بیوہ دادی نے پڑھا لکھا کر قابل بنایا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تعلیم عام نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکوں کو نہ صرف تعلیم دلوائی بلکہ اپنی منصب اور زیور بیچ کر ایک کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان یعنی لندن بھجوایا جب کہ یہ ایک نہایت مشکل امر تھا۔ اس زمانے میں بیرونی سفر پانی کے جہاز سے ہوتا تھا اور اس سفر کے لیے مہینے درکار ہوتے تھے۔

بی جنّی ان ہی دنوں بھونگیر سے حیدرآباد منتقل ہوگئیں اور محلہ لال ٹیکری کے ایک آرائش بلدہ کے مکان میں سکونت پذیر ہوئیں جب کہ اس جاگیر دارانہ ماحول میں آرائش بلدہ کے مکان میں رہنا ایک چیلنج تھا۔ وہ بڑی باہمت اور ذی شعور خاتون تھیں۔ میرے چھوٹے بھائی سید علیم عباس اور میری تعلیم و تربیت ان کے ذمہ قرار پائی پھر ہم دونوں ان کی سرپرستی میں آگئے اس وقت میری عمر کوئی چھے یا سات سال کی تھی اور میرے چھوٹے بھائی کی چار یا پانچ سال کی۔ ان دنوں ہم دونوں

MOST HOLY ROSERY CONVENT اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ہم مدرسہ کو جھٹکے میں جایا کرتے تھے جو اس زمانے کی ایک سواری تھی جو آگے چل کر ٹانگے کی شکل اختیار کر گئی۔ ہمارے ہمراہ ایک ملازم ہوتا تھا جو گھر ہی کا ایک فرد سمجھا جاتا تھا اس زمانے میں امرا اور متمول خاندان کے لڑکے مدرسہ کو بگھیوں میں آتے تھے جو ان کی ذاتی سواری ہوتی تھی۔ بگھی کے ہانکنے والے کوچوان کہتے تھے۔ اور بگھی کے پیچھے ایک آدمی نگہبان کے طور پر کھڑا ہوتا تھا۔ بگھی ہو یا ٹانگہ دونوں ہی کو گھوڑے کھینچتے تھے۔ ایک اور سواری شکرام ہوتی تھی جسے دو بیل کھینچتے جس میں ہم بی جنّی کے ساتھ کوہِ مولا علی جایا کرتے تھے اور اس سفر میں صبح سے شام ہوجاتی تھی۔ غرض ہم جھٹکے میں اپنے مدرسے جایا کرتے تھے۔ ہمارا راستہ براہِ باغ عامہ ہوا کرتا تھا اور راستے میں ناملی اسٹیشن کی گیٹ پڑتی تھی جو ہمیشہ کھلی رہتی تھی کیوں کہ شاذ ہی کوئی ٹرین یہاں سے گزرتی تھی لیکن آج کل اس ریلوے گیٹ پر ایک پل پڑ گیا ہے اور ٹرینوں کی آمد و رفت کی بہتات ہوگئی ہے۔

ہم سویرے ہی اسکول کے لیے نکل جاتے تھے اور ہماری بی جنّی تو چراغ لگا کر ناشتہ کرتی تھیں یعنی ان کے ناشتے کے بعد سورج طلوع ہوتا تھا ان کا ناشتہ کلچے جسے ہم آج شیرمال کہتے ہیں اور بالائی ہوا کرتا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب ناملی میں ایک نان بائی تھا جو رات کے دو بجے اپنا تندور سلگاتا تھا اور اندھیرے ہی سے کلچے تیار ملتے۔ ہماری بی جنّی وقت کی نہایت پابند اور منظم خاتون تھیں۔ وقت کی پابندی کا درس

ہمیں ان سے ملا ہے۔
ہمارا اسکول رومن کیتھولک مشنری کے تحت تھا۔ جہاں ایک طرف گرجا گھر تو دوسری طرف مقدس مریم کا مجسمہ نصب تھا۔ پھر ایک طرف صلیب پر لٹکے اس معصوم انسان کا مجسمہ نظر آتا جسے لوگ حضرت عیسیٰ کہتے ہیں۔ اسی مجسمہ کے قریب ہم اپنا دوپہر کا کھانا کھاتے اور عین اسی وقت گرجے کے گھنٹے بجا کرتے۔ گھنٹوں کی یہ گونج میرے کانوں میں بس گئی اور میرے تحت الشعور میں بیٹھ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میری اکثر کہانیوں میں گرجے کے گھنٹوں کا ذکر ملتا ہے۔

ان دنوں ہمارے اسکول کو ہفتے میں تین دن تعطیل ہوتی تھی یعنی جمعہ، ہفتہ اور اتوار پھر موسمِ گرما میں تین ماہ کی طویل چھٹیاں۔ ان ہی چھٹیوں میں ہم بھونگیر چلے جایا کرتے جہاں دن بھر کھیل کود، پیراکی، دھما چوکڑی میں گزارتے اور شام کو ہماری نانی ماں ہم کو کہانیاں سنایا کرتیں۔ ہماری نانی ماں بڑی وضع دار خاتون تھیں۔ گھر کافی بڑا تھا پھر بھی وہ گھر کے ایک کونے کو اپنا ٹھکانہ بنالیتیں اور وہاں سے کم ہی ہٹتیں۔ وہ بہت کم گو تھیں۔ آج جب میں "فسانہ عجائب" یا "گلزارِ نسیم" پڑھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میں بچپن میں اپنی نانی سے یہ سب سن چکا ہوں۔ ہر شام میں اپنی نانی سے کہانی کی فرمائش کرتا اور وہ ہر شام وہ ایک نئی کہانی سناتیں۔ میں ان کہانیوں میں بہت دل چسپی لینے لگا اور خیالوں میں کہانیوں کے تانے بانے بننے لگا اسی زمانے سے مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

میں شاید مڈل اسکول میں تھا جب میں نے پہلی کہانی " پیاسے نین " لکھی تھی وہ کہانی میرے حافظے سے نکل چکی ہے لیکن اس کہانی کا ایک جملہ آج بھی مجھے یاد ہے ۔ " نینوں کا پیاسا پیاسا ہی رہ گیا "

وہ شاید ۱۹۳۹ ء کی بات ہے جب میرے والد کو حیدرآباد میں " بیگم پیٹ پل " تعمیر کرنے کا ایک بڑا گتہ ملا ۔ (وہ پل موجودہ فلائی اوور کے نیچے آگیا ہے) ان ہی دنوں میرے والد اور والدہ بھونگیر سے حیدرآباد منتقل ہوگئے اور خیریت آباد کے ایک آرائش بلدہ کے مکان میں رہنے لگے ہم دونوں بھی بی جنی کے پاس سے اپنے والدین کے پاس آگئے ۔ میں اس وقت تک مڈل اسکول میں آچکا تھا ۔ مجھے اس زمانے کی زیادہ باتیں یاد نہیں ہاں مگر اتنا یاد ہے کہ میں یہاں آکر سگریٹ پینا اور " فلش " یعنی تین پتے کھیلنا سیکھ گیا ۔ اس محلہ کے میری ہم عمر لڑکے پڑھتے لکھتے کم تھے اور آوارگی زیادہ کرتے تھے ۔ جو میرے والدین کو قطعی پسند نہ تھا ۔ پھر بھی ہم نے کچھ عرصہ یہاں گزارا ۔

کچھ عرصے بعد ہم لوگ حمایت نگر منتقل ہوگئے جو اس زمانے کا ایک صاف ستھرا اور پڑھے لکھے لوگوں کا محلہ تھا ۔ پھر ہم دونوں میرے بھائی علیم عباس اور مجھے مدرسہ ء عالیہ میں شریک کرادیا گیا ۔ مدرسہ ء عالیہ میں بھی پڑھنا ان دنوں فخر کی بات تھی ۔ پھر میں میٹرک پاس کر کے نظام کالج میں داخلہ لے لیا ۔ ان دنوں نظام کالج وہ واحد کالج تھا جہاں مخلوط تعلیم ہوتی تھی اور اس کالج میں داخلہ ملنا ایک مشکل امر تھا ۔ پھر بھی مدرسہ ء عالیہ کے طالبِ علموں کے لیے ایک خاص رعایت رکھی گئی

تھی ۔ میں کالج میں آگیا تو پھر سے کہانیاں لکھنے کا شوق چرایا لیکن یہ شوق بھی ادھورا رہ گیا کیوں کہ اسی زمانے میں مجھے ایک نہایت خوب صورت دوشیزہ سے محبت ہوگئی جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی اور میری بہن عباسی کی دوست تھی ۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ماں ، باپ ، بھائی ، بہن سب ہی اس رشتے کے خلاف تھے میرے والد اور میری بہن میرے حامی تھے ۔ میں ابھی اپنے والدین کے زیرِ پرورش تھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں تھا ۔ ایک عجیب سی کشمکش تھی ۔ میں ملازمت کا متلاشی تھا ۔ جو مل نہیں رہی تھی اور اس کے لیے مسلسل پیام آرہے تھے ۔ وقت گزرا چلا جارہا تھا اور میں یہاں کے حالات سے تنگ آچکا تھا ۔

وہ موسم گرما کی ایک دوپہر تھی ہم دونوں میری محبوبہ اور میں حیدرآباد سے چل پڑے اور بمبئی میں میرے چھوٹے چچا کے بزرگ دوست اور عالمِ دین محمد آغا نجفی کے ہاں پناہ لی جنھوں نے ہمارا شرعی نکاح ماہ مارچ ۱۹۵۳ء میں پڑھا اور ادھر حیدرآباد میں ہنگامہ ہوگیا ۔

بمبئی میں میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوگیا اور فلموں کے منظر نامے لکھنے لگا لیکن یہ وابستگی بھی زیادہ دنوں تک نہ رہی ۔ اس پر بھی میری کہانیوں پر منظر نامے کی چھاپ ملتی ہے اسی لیے میں نے طے کیا کہ میں اپنے پڑھنے والوں کو کہانی دکھاؤں گا ۔ میں نے اپنی کتاب کے پہلے ہی صفحے پر جلی حروف میں لکھا ہے کہ " میں کہانی دکھانا چاہتا ہوں " دیکھیے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں ۔

بمبئی کی ہماری زندگی مختصر رہی ۔ یہاں میرے ایک اور چچا سید عابد حسین سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں پاکستان سے بمبئی آئے ہوئے تھے اور یہاں تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ وہ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد چھوڑ چکے تھے انھوں نے ہم دونوں طاہرہ اور مجھے اپنے ساتھ اسی ہوٹل میں ٹھہرا لیا اور نہ صرف ہمارا ذہنی ساتھ دیا بلکہ ہمارے اس اقدام کو صحیح اقدام قرار دیا پھر ہم دونوں طاہرہ اور میں حیدرآباد لوٹ آئے ۔

بہ تاریخ ۲ / فروری ۱۹۵۴ ء کو طاہرہ نے ایک لڑکے کو جنم دیا جس کا نام ہم نے سید شاہد عباس رکھا شاہد عباس اب بڑھے ہوگئے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش ہیں میری ہم سفر نے بڑے ناہم وار راستوں پر میرا ساتھ دیا لیکن وہ دور تک نہ چل سکی اور عین نوجوانی میں بہ تاریخ ۲۰ / اکتوبر ۱۹۵۵ ء کو عدم کی راہ لی ۔ اس سانحے کے بعد میں بالکل ٹوٹ سا گیا زندگی سے بےزارگی محسوس کرنے لگا تو خودکشی کی سوچنے لگا ۔

ایک شام جو بڑی اداس تھی میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ایک مےخانے کے سامنے سے گزر رہا تھا میرے قدم خود بہ خود اس جانب اٹھ گئے اور ہاتھوں نے جامِ مے کو تھام لیا ۔ راشد آزر نے جام بڑھاتے دور چلنے لگے ۔ ۔ ۔ قدم جمنے لگے ۔ ۔ ۔ اور میں موت سے زندگی کی طرف آنے لگا ۔ اسی زمانے میں میں نے کہانی " نغمہ ء ناتمام " لکھی جو طاہرہ اور میری زندگی کی عکاسی کرتی ہے جس کو میں نے اب " زندگی کی

کتاب " کا نام دیا ہے۔

دس سال تک میں بکھرا بکھرا اجڑا اجڑاسا رہا۔ ۱۹۶۵ء میں میری زندگی میں ایک نیا اور خوش گوار موڑ آیا ۴ / اپریل ۱۹۶۵ء کو میں نے سکینہ کو اپنا شریکِ حیات بنالیا جو پڑھی لکھی ، ملازمِ سرکار تھیں۔ جس نے میری زندگی کو خوب صورت روپ دیا اور میرا دامن محبتوں سے بھر دیا پھر اس نے میرے لڑکے کو اپنالیا۔ ماں باپ بہن بہنوی کی دیکھ بھال کی جو زمانے کے ہاتھوں پراگندہ ہوگئے تھے۔ اس نے مجھے پرسکون زندگی دی اور مکمل ذہنی آسودگی بخشی۔ جس نے میرے ادبی ذوق کو سہارا دیا جو اب میری شریکِ حیات ہی نہیں بلکہ سب کچھ ہے۔ میں پھر سے کہانیاں لکھنے لگا۔ میری کہانی " حیات کا رقص " اس کی اور میری زندگی کی عکاسی کرتی ہے جو میری کہانیوں کے مجموعے کا نام بھی ہے۔ اس اثنا میں ہماری زندگی میں ایک لڑکی تسنیم فاطمہ اور ایک لڑکا سید احمد عباس آئے۔ تسنیم فاطمہ اب تنسیم حسین بن گئی ہیں اپنے شوہر میر جاوید حسین کے ساتھ دوحہ قطر میں خوش حال زندگی بسر کر رہی ہیں ، احمد عباس اپنی شریکِ حیات سلمہ عباس کے ساتھ ہوسٹن امریکہ میں خوش ہیں۔

ایک عرصہ بعد راشد آزر اور نصرت محی الدین کی کوششوں نے حیدرآباد میں پھر سے " انجمن ترقی پسند مصنفین " کی بناء ڈالی تو سکینہ اور میں اس کے رکن بن گئے۔ راشد آزر نے سکینہ میں چھپے کہانی کار کو پہچانا تو انھیں کہانیاں لکھنے پر اکسایا اب سکینہ بچوں کی پڑھائی اور ان کی شادیوں سے فارغ ہوچکی تھیں وہ ادب کے اس میدان میں بھی مجھ سے آگے نکل

گئیں اور ۱۹۹۳ء میں اپنے افسانوں کا مجموعہ " صلیب کا بوجھ " چھپوا ڈالا۔
میں راشد آزر کا مشکور و ممنون ہوں کہ جن کی مدد کے بغیر کہانیوں کا یہ مجموعہ منظر عام پر نہیں آ سکتا تھا۔ ان ہی کے اصرار کا یہ نتیجہ ہے۔

راشد آزر ایک ممتاز شاعر، ایک دانش ور اور مارکسسٹ ہیں مارکسی فلسفہ کا انھوں نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ویسے بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست جامعہ ء عثمانیہ حیدرآباد کے پروفیسر ہیں انھو نے میری کتاب کا فلیپ لکھ کر مری کتاب کی وقعت بڑھائی۔ ان کی نظر اردو ناول پر گہری ہے۔

بیسوی صدی کے ناول پرڈاکٹر یوسف سرمست کی گہری بصیرت اور کئی صفحات کے مقالے لکھ کر انھوں نے تنقید کو ایک تخلیقی فن کا درجہ دیا۔ اپنے تحقیقی و تنقیدی مقالوں میں ڈاکٹر یوسف سرمست نے اردو ناول پر تحقیق و تنقید کا ناقابلِ تردید معیار قائم کیا ہے۔
" حیات کا رقص " حیات کے فلسفے سے دور نہیں ہے فلسفہ ء حیات کا میرے چچیرے بھائی ذکی شاداب نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے جامعہ ء عثمانیہ سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا اور لندن اور ایڈن برا یونیورسٹیز میں لگ بھگ پانچ برس تک ادب اور فلسفہ ء پر ریسرچ کا کام کیا۔ اپنی چھوٹی بحر کی غزل میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

دو جہاں کی یہ گردشیں ہیں عجب
راز اتنا کھلا کہ راز رہا

زندگی مختصر سہی لیکن
قصہ زندگی دراز رہا

مجھے یہاں ڈاکٹر مغنی تبسم کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جو ہندستان کے ایک نام ور تنقید نگار دانش ور اور شاعر ہیں۔

کبھی کبھی وقار لطیف بے اختیار یاد آجاتا ہے۔ آج اگر وہ ہوتا تو نہ جانے کتنی بحثیں کرتا میری ایک کہانی "اپرادھی" پر اس نے کہا تھا۔۔
"تم بالکل باغی ہوگئے ہو" آہ۔۔۔ وقار لطیف۔

اب میری کہانیوں کے بارے میں سنیئے۔ میری اکثر کہانیاں لفظِ سورج سے شروع ہوتی ہیں کیوں کہ روشنی اور حرارت ہی زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ میں نے اپنی کہانیوں میں تضادات پیش کیے ہیں۔ عقائد کے تضادات، مذاہب کے تضادات، نظریوں کے تضادات، رسومات کے تضادات، میں ذاتی طور پر اختر حسن رائے پوری اور اقبال متین سے متاثر ہوں۔ اختر حسن رائے پوری کے افسانوں کے مجموعے "محبت اور نفرت" کا پہلا افسانہ "برگد کا درخت" نہایت فلسفیانہ ہے جس نے مجھے کافی متاثر کیا ان کے افسانے جیسے "اندھا بھکاری" اور دوسرے پڑھنے کے لائق ہیں۔

اقبال متین یقیناً برِّ صغیر کے ممتاز افسانہ نویس ہیں ۔ انھوں نے اردو ادب کو " مسدود راستے "، " کینڈل کالونی "، " گھٹری "، " لکڑی کا آدمی "، " گریو یارڈ "، " درد کا رشتہ " جیسی کہانیاں دی ہیں ۔ کہانی " مسدود راستے " میری ذہن پر اب بھی چھائی ہوئی ہے ۔ بیگ احساس بھی علامتی کہانیاں اچھی لکھتے ہیں ۔

میری آخری کہانی جس کو میں یہاں پہلی کہانی کے طور پر پیش کر رہا ہوں اس کو میں نے ۱۹۹۵ء ہوسٹن امریکہ میں لکھا ہے ۔ اس کا عنوان میں نے " گھنٹے نہیں بجیں گے " رکھا تھا کیوں کہ یہاں ہوسٹن میں اکثر گرجا گھر میتھوڈسٹ ہیں جن پر گھنٹے نہیں ہوتے تو ظاہر ہے کہ یہاں کرسمس کے موقع پر نہ نئے سال پر اور نہ کسی عیسائی کی موت پر گھنٹے بجتے ہیں ۔ برعکس اس کے ہمارے شہر حیدرآباد میں کرسمس کے موقع پر نئے سال پر اور کسی کیتھولک کی موت پر گرجے کے گھنٹے بجتے ہیں ۔ دوسری وجہ اس عنوان کی یہ تھی کہ اس کے بعد کی کہانی " گھنٹے بجتے رہے " ہے ۔ میرے لڑکے احمد عباس کو " گھنٹے نہیں بجیں گے " عنوان پسند نہیں آیا اور اس نے اس کہانی کا عنوان " ہونی انہونی " تجویز کیا جو مجھے بھی پسند آیا اور موضوع بھی ہے کہانی آپ کے سامنے ہے ۔

میری دوسری کہانی " گھنٹے بجتے رہے " اس کہانی میں سرمایہ دارانہ نظام کی ایک حقیقت پیش کی گئی ہے جہاں انسان کی قدر و منزلت اس کی دولت سے ہوتی ہے ۔

" صلیب ایک نشانی " میری پسندیدہ کہانی ہے جیسا کہ میں کہہ

چکاہوں کہ صلیب سے میرا ایک ذہنی ربط ہے اور " صلیب کا بوجھ " نام بھی متاثر کرتا ہے جو میری شریکِ حیات سکینہ وسیم عباس کی کتاب کا نام ہے۔

" زندگی کی کتاب " اور " حیات کا رقص " یہ دونوں کہانیاں میری زندگی کی عکاسی کرتی ہیں جس میں میَں نے خود اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔

" اور چراغ جلتے رہے " میں مذہب کے کھوکھلے تصوّر پر چوٹ ہے اور محبت کی عظمت کو سراہا گیا ہے۔

کہانی " کرب " میں بھی مذہب کے ٹھیکہ دار پر طنز ہے اور زمانے کی بے راہ روی پر چوٹ۔ میں کہانیوں کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا کیوں کہ یہ کام تبصرہ اور تنقید نگاروں کا ہے۔

○●○

"ہونی انہونی"

سورج دھندلکے میں کہیں غائب ہوگیا تھا۔ شہر ہوسٹن کہر میں ڈوب گیا تھا۔ ہر طرف دھندلکا تھا اندھیرا تھا۔ غضب کی سردی تھی۔ مسلسل پھوار ہورہی تھی۔ درجہ ء حرارت اس قدر گر گیا کہ نلوں میں پانی منجمد ہوگیا تھا۔ سڑکوں اور پلوں پر برف جم گئی تھی۔ شہر کے ٹی۔ وی۔ اسٹیشن اور ریڈیو اسٹیشن موسم کی برابر اطلاع دے رہے تھے۔ عوام کو گھروں میں رہنے کی تاکید کی جارہی تھی۔ گاڑیوں میں نصب ریڈیو سٹ آگاہ کر رہے تھے کہ پلوں پر برف جم گئی ہے۔ راستہ تبدیل کرلیا جائے یا پھر واپس گھروں کو لوٹ جائیں۔ پولیس کی گاڑیاں برابر طلائیہ گردی میں مصروف تھیں۔ اس کے باوجود یہاں کی کاروباری زندگی رواں دواں تھی۔ البتہ جن شاہراہوں پر گاڑیاں (اسی) ۸۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتی تھیں آج وہ (دس) ۱۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے رینگ رہی تھیں۔ پھر بھی ہیلی کاپٹر ٹریفک کی نگہ بانی کر رہا تھا اور ہر حادثہ پر اس کی نظر تھی۔ بلدیہ کی

گاڑیاں برف پر مسلسل سنگ ریزے بچھا رہی تھیں ۔ شام ہوتے ہوتے اندھیرا اور بڑھ گیا ۔

(انیس) ۱۹ سالہ نوجوان جیک وقت اور حالات کی پرواہ کیے بغیر اپنے گھر سے چل پڑا ۔ وہ صبح سے کافی بیئر پی چکا تھا ۔ اس میں جولانی آگئی تھی ۔ وہ ترنگ میں تھا اور ان مخدوش راستوں پر اس کی گاڑی کے پہیے اسی تیزی سے گھوم رہے تھے جس طرح اس کے خیالات میں نورا کی زندگی ۔ اس کے ذہن میں نورا کی ایک تصویر ابھرتی ایک ڈوبتی ۔ اس نے اپنی گاڑی کی رفتار اور تیز کردی ۔ وہ جلد از جلد نورا تک پہنچ جانا چاہتا تھا ۔ آج نورا کی (سولہویں) ۱۶ سالگرہ کی پارٹی تھی ۔

نورا خوب صورت تھی ۔ اس کے بدن سے بھرپور جوانی ٹپکتی تھی ۔ جیک بھی ایک صحت مند منچلا نوجوان تھا ۔ بچپن میں دونوں ایک ہی اسکول کو ایک ہی اسکول بس میں جایا کرتے تھے ۔ ان دونوں کے مکان بھی آمنے سامنے تھے ۔ دونوں باسکٹ بال شوق سے کھیلتے ۔ وقت گزرتا گیا اور یہ دونوں اپنی عمر سے زیادہ دکھائی دینے لگے ۔

امریکن لڑکے لڑکیاں جلد جوان ہوجاتے ہیں کیوں کہ یہاں کھانے پینے کو بہت کچھ مل جاتا ہے ۔ یہاں ذہنی آسودگی بھی ہے کیوں کہ یہاں ہر قسم کی آزادی ہے ۔ یہاں تک کہ جنسی ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لڑکے لڑکیوں میں FRUSTRATION نہیں پایا جاتا ۔ نورا اور جیک دونوں اسکول میں پڑھتے ہوئے بھی اپنا روزگار کما لیتے تھے اور وہ خود مکتفی تھے ۔ باسکٹ بال کھیلنے سے ان کے قد لمبے ہوگئے تھے ۔

ایک دن نورا اور جیک باسکٹ بال کھیل رہے تھے اچانک نورا کا پیر پھسل گیا جیک نے آگے بڑھ کر نورا کو سنبھال لیا۔ نورا کا بھرا بھرا جسم جیک کی بانہوں میں آگیا جیک کے ذہن میں ایک ہیجان پیدا ہوا اس نے نورا کو بھینچ لیا اور اپنے ہونٹ نورا کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے۔

کچھ دنوں بعد نورا اس محلہ سے دور چلی گئی۔ اس کے ماں باپ ایک دوسرے ہی محلے میں منتقل ہوگئے پھر بھی یہ دونوں رستوراں اور پارک میں ملتے رہے۔ ایک دوسرے سے لپٹتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہونٹوں کا رس پیتے رہے وقت گزرتا رہا۔

دوسری طرف مذہبی عقائد پر پورا یقین رکھنے والے (پینسٹھ) ۶۵ سالہ اسلم کا دل بیٹھنے لگا۔ گو کہ اسلم کسی حادثہ سے دوچار نہیں ہوا تھا پھر بھی اس کی زندگی میں عجیب عجیب تبدیلیاں آئیں۔ اس کو اپنا وطن چھوڑے ایک عرصہ ہوگیا تھا۔ وہ لندن چلا گیا پھر وہ وہاں کی غیر مانوس زندگی میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ تنِ تنہا وہ وہاں پوری طرح جم نہ پایا اور وہ اپنے وطن لوٹ آیا۔ یہاں آکر اس نے شادی کرلی اور حبیبہ اس کی شریکِ حیات بن گئی۔ ہندستان کی بے روزگاری نے انھیں معاشی آسودگی نہ بخشی اور پھر وہ دونوں لندن جانے پر مجبور ہوگئے۔ جہاں اسلم اور حبیبہ دونوں ہی کام کرنے لگے اور کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں ایک لڑکی پھر لڑکا تولد ہوئے۔ اب لندن کے حالات بھی تبدیل ہورہے تھے۔ ملک میں گرانی بڑھتی جارہی تھی۔ بچے بڑے ہورہے تھے۔ ماں باپ کے لیے ان کی تعلیم مسئلہ بن گئی۔ اسلم نے ہوسٹن امریکہ جانے کی

ٹھانی ۔ لندن کی گرانی اور ہوسٹن کی ارزانی ۔ اس نے ان کا تقابل کیا اور ہوسٹن کو ترجیح دی ۔ وہ اپنے وطن تو قطعی لوٹنا نہیں چاہتا تھا ۔ ایک دن سارا خاندان ہوسٹن منتقل ہوگیا ۔

اسلم کے لیے پھر یہ زندگی کا نیا سفر تھا ۔ امریکہ کی زندگی برق رفتار تھی اور وہ زندگی کی راہ پر چلتے چلتے تھک گیا تھا یہاں تو اس کو دوڑنا تھا ذہن ساتھ بھی دیتا تو دل ساتھ نہ دیتا ۔ وہ اٹھتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا ۔ دل و دماغ میں ایک کشمکش سی تھی ۔ دل نے ساتھ نہ دیا اور ایک دن اسلم پر دل کا دورہ پڑا ۔ حبیبہ اور بچے پریشان ہوگئے ۔ دوائیں ۔ ڈاکٹر ۔ سب بے کار ۔ پھر سرجنوں نے بائی پاس سرجری کا مشورہ دیا ۔ یہاں ہر بات بہت جلد طے پاجاتی ہے ۔ اور ڈاکٹر ہمیشہ سرجری کے لیے تیار رہتے ہیں ۔ اسلم کی بائی پاس سرجری ہوگئی ۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے ۔

وقت کا دریا چڑھتا اترتا رہا لیکن اسلم ۔ ۔ ۔ اس کے دل نے پھر سے اس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا دن بہ دن اس کا بلڈ پریشر گرتا گیا ۔ جسم کی حرارت کم ہوتی گئی اور دل کام کرنے سے قاصر ۔ ڈاکٹر دوائیں اور انجکشن دیتے دیتے عاجز آگئے ۔ اب اسلم پھر زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا اور ڈاکٹر اسے موت سے چھٹکارہ دلانے کی ہر ممکنہ کوشش میں لگے رہے دل کے بڑے بڑے ڈاکٹر ایک ساتھ بیٹھے صلاح و مشورہ کرنے لگے ۔ اسلم کو ہر حال میں بچانا تھا ۔ طے پایا کہ اسلم کا دل جلد از جلد تبدیل کردیا جائے یعنی HEART TRANS PLANT کیا جائے ۔ ایک صحت مند

دل اسلم کے سینے میں پیوند کیا جائے ۔ جس کے لیے ملک کے مختلف ہسپتالوں کو اطلاع دے دی گئی کہ ایک صحت مند دل جلد از جلد فراہم کیا جائے ۔

شہر ہوسٹن کی گیارہ منزلہ سر بلند میتھوڈسٹ ہسپتال کی رشکِ فردوس عمارت جو کسی FIVE STAR ہوٹل سے کم نہیں ، کھڑی انسانی زندگی کی نگہہ بانی کر رہی تھی ۔ ڈاکٹر فرشتوں کی طرح کام کر رہے تھے اور مریضوں کو نئی زندگی عطا کر رہے تھے ۔ ان کو موت کے منھ سے نکال رہے تھے پھر بھی صحت مند دل کا ملنا دشوار تھا ۔ ایسا دل حاصل ہوتا تھا کسی صحت مند انسان کے کار کے حادثے سے دماغ پر چوٹ لگ کر موت واقع ہوجانے سے یا پھر کسی انسان کے دماغ کی رگ پھٹ کر مر جانے سے ۔ مرنے کے بعد اپنے اعضا عطیے کے طور پر دے دینا انسانی فکر کی معراج اور اس ملک کے لوگوں کی ذہنی ترقی کی علامت ہے اور اس پیوند کاری میڈیکل سائنس کا کارنامہ اور اس کی قدرت کا کرشمہ ہے ۔

اسلم کو ایک بار پھر میتھوڈسٹ ہسپتال میں شریک کرلیا گیا ۔ اس کی بیوی حبیبہ پیش آنے والے حالات سے کانپ کانپ گئی ۔ بچے حیران و ششدر باپ کا منھ دیکھتے رہے جب ڈاکٹر نے اسلم کو کچھ فارم دستخط کرنے کے لیے دے دیئے تو اسلم ایک نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہوگیا ۔ اس کے عقائد اور حالات جائز ناجائز کا فلسفہ حرام حلال کا تصور ، پاک نا پاک کا خیال ، لیکن کوئی دل ناپاک کیسے ہوسکتا ہے ۔ اسلم نے کانپتے ہاتھوں سے فارم پر دستخط کردیئے اور فارم ڈاکٹر کو تھما دیئے ۔

نوجوان جیک کے ہاتھ اس کی کار کے اسٹیرنگ کو پوری طاقت سے پکڑے ہوئے تھے پھر بھی اس کی تیز رفتار کار اندھیرے کو دیر تک نہ چیر سکی اور دفعتاً فضا میں ایک دھماکا ہوا ۔ جیک کی کار بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی اور اس کا سر گاڑی کی اسٹیرنگ سے ۔ پولیس کی گاڑیاں آناً فاناً میں مقامِ حادثہ پر پہنچ گئیں اور سکنڈوں میں امبولنس طلب کرلی گئی ۔ امبولنس جیک کو لیے میتھوڈسٹ ہسپتال کی طرف چل پڑی موسم نہایت خراب تھا اور جیک کے سر پر زبردست چوٹ آئی تھی ۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے جیک کی دماغ کی رگیں پھٹ چکی تھیں ۔

میتھوڈسٹ ہسپتال کے دو آپریشن تھیٹر تیار تھے ۔ ایک جیک کے لیے دوسرا اسلم کے لیے ۔ دو اسٹریچر ایک سمت لے جائے جارہے تھے ۔ جیک کے کے سینے پر صلیب لٹکی تھی ۔ اسلم کے بازو پر تعویذ بندھی تھی ۔ اسلم کے ساتھ اس کی حبیبہ اور بچے ۔ جیک کے اسٹریچر کے ساتھ صرف ہسپتال کی نرسیں ۔ حبیبہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ زندگی کے ایک عجیب امتحان سے گزر رہی تھی ۔ اس میں چلنے کی سکت نہیں تھی ۔ وہ کانپ رہی تھی ۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ۔ اس کے دونوں بازو اس کا لڑکا اور لڑکی تھامے ہوئے تھے ۔ آخر کار آپریشن تھیٹر آگیا ۔ دروازہ کھلا ۔ اسلم کا اسٹریچر تھیٹر میں داخل ہوا۔دروازہ بند ہوگیا ۔ سرخ بتی روشن ہوگئی ۔ حبیبہ اور بچے آپریشن تھیٹر کے سامنے بیٹھ گئے ۔ کوئی چھ گھنٹے کا آپریشن تھا ۔ اسلم کے جسم کو مکمل طور پر بے حس کردیا گیا یعنی اس کا جسم TOTAL ANESTHESIA کے اثر میں آگیا ۔ دوسرے

تھیٹر میں جیک کا بے روح جسم جس کا دل ابھی دھڑک رہا تھا۔ اس کا سینہ چاک کردیا گیا سرجن اس کے جسم سے ویسا ہی برتاؤ کر رہے تھے جیسا کہ زندہ انسان کے جسم سے کیا جاتا ہے۔ نوجوان جیک کے دل کو جامد یعنی FREEZ کردیا گیا۔ اب اس کی حرکت بند ہوچکی تھی۔ پھر اس کو سینے سے نکال لیا گیا۔

اسلم INTUBAT یعنی سانس لینے کی مشین پر ڈال دیا گیا اور اس کا جسم ربر کی کئی ایک نالیوں کے ذریعے مشینوں سے مربوط کردیا گیا اب اسلم کے دل اور پھیپھڑوں کا سارا کام ہارٹ لنگ HEARTLUNG مشین کر رہی تھی اور اس کا جسم مکمل طور پر مردہ تھا۔ اس کا سینہ بھی کھولا گیا اور دل کو نکال کر FREEZ کر دیا گیا۔ میڈیکل سائنس نے صوم و صلاۃ کے پابند اسلم اور منچلے عیسائی جیک دونوں ہی کے دلوں کو جامد کردیا تھا پھر ایک عیسائی کا منجمد دل ایک مردِ مومن کے سینے میں پیوند کیا جانے لگا۔ جیک کے مردہ جسم کو مارک MORQUE میں لا لیا گیا۔ پھر FUNERAL DIRECTORS نے اس کے جسم کو فیونرل ہوم FUNERAL HOME[1] لے آئے جہاں اس کی لاش کو عمدہ کپڑے پہنائے گئے اسے سنوارا گیا۔

رات بہت زیادہ تاریک ہوچکی تھی۔ جیک کے ماں باپ۔ نوزا اور اس کے دوست احباب سب ہی فیونرل ہوم پہنچ گئے۔ ایک عجیب اور کرب ناک منظر تھا۔ رات کی تاریکی تھی۔ وحشت تھی۔ خاموشی تھی۔

---

[1] ہسپتال سے جہاں لاشیں لے جائی جاتی ہیں۔

کوئی چیخ نہ پکار نہ رونے کی آوازیں ۔ میت ایک عمدہ تابوت میں رکھ دی گئی اور تابوت ہرس HEARS[1] میں رکھ دیا گیا HEARS کا دروازہ بند ہوگیا ۔

اسلم کا چاک سینہ بند کردیا گیا منجمد دل کر حرارت پہنچائی جانے لگی اور مشینوں سے جڑی ایک ایک نالی کو علحدہ کیا جانے لگا ۔ آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی برابر جلتی رہی ۔

کہر چھٹ گئی تھی نوجوان جیک کی ہرس HEARS جس کے دونوں بازو سرخ کپڑوں میں ملبوس کانسٹبل اپنی سرخ موٹر سیکلوں پر سوار سرخ سگنل کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ رہے تھے ۔ آج یہ سرخ سگنل ان کو نہیں روک سکتے تھے ۔ ایک طویل فاصلہ تھا ۔ گاڑیوں کا ایک بڑا جلوس ۔ سڑک پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا ۔ راستے کے میتھوڈسٹ گرجا گھر خاموش کھڑے تھے ۔ نہ کوئی گھنٹہ نہ کوئی آواز ۔ یہ کیسی ہونی انہونی تھی ۔ گریو یارڈ کی مدھم بتیاں جل رہی تھیں ۔ آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی بجھ گئی تھی ۔

سورج طلوع ہورہا تھا ۔

○●○

[1] وہ گاڑی جس میں تابوت لے جایا جاتا ہے ۔

"گھنٹے بجتے رہے"

گرجے کے گھنٹے شام کے سہانے پن کا پیغام سنا رہے تھے۔ دیوار پر لگی گھڑی کی سوئیاں ایک سو اسّی (۱۸۰) ڈگری کا زاویہ بنائے استادہ تھیں۔ سفید بڑے ڈائیل پر سیاہ گھومتی سوئیاں چھے (۶) بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ چھے (۶) بجتے ہی رمیش کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رمیش کے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی لیکن گھڑی کی ٹک ٹک جوں کی توں رہتی۔ رمیش کے لیے یہ روز کا معمول تھا ادھر گرجے کے گھنٹے بجتے ادھر رمیش کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی اور رنجنا کی مدھر آواز رمیش کے کانوں میں رس گھولتی۔

وہ نئے سال کی ایک شام تھی گرجے کے گھنٹوں کے ساتھ رمیش کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی رنجنا نے رمیش کو کلب آنے کی دعوت دی۔ کلب میں آج نئے سال کا مخصوص رقص تھا۔ دونوں کلب پہنچے۔ آرکسٹرا کی سریلی دھن کلب میں گونج رہی تھی اور لوگوں کو دعوتِ رقص دے رہی تھی۔ آرکسٹرا رواں دواں تھا۔ بوڑھے اور نوجواں جوڑے دونوں ہی

ڈانس فلور کی طرف دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہے تھے ۔ رمیش اور رنجنا بھی ڈانس فلور پر پہنچ گئے ۔ رقص شروع ہوا ۔ رمیش اور رنجنا ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے آرکسٹرا کی دھن پر جھومنے لگے ۔ آرکسٹرا نے دھن بدلی رمیش نے رنجنا کو اپنے سینے سے چمٹا لیا ۔ شدتِ جذبات سے ان کے دل دھڑکنے لگے ۔ پل بھر کے لیے روشنیاں گل ہوئیں ممکن تھا کہ رمیش رنجنا کے دہکتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا لیکن روشنیاں جگمگا اٹھیں ۔ آرکسٹرا رک گیا ہر طرف HAPPY NEW YEAR کا شور تھا ۔ رمیش اور رنجنا لان پر پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ موسم بڑا پرکیف تھا ۔ رات بڑی دل کش تھی آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے ۔ چاند بدلی کی اوٹ سے جھانک رہا تھا ۔ رمیش وسکی پی رہا تھا اور رنجنا کافی ۔ دونوں دنیا سے بے خبر اس کی تلخیوں سے بہت دور سبزہ زار پر بیٹھے ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے ۔ ایک دوسرے میں مدغم تھے ۔ وقت کا دریا تیزی سے بہا چلا جارہا تھا ۔ کچھ دیر بعد کلب کی روشنیاں گل ہونے لگیں کاروں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آنے لگیں ۔ بادل گرجنے لگے ۔ چاند ڈوب گیا ۔ رمیش اور رنجنا بھی کلب کے لان پر سے اٹھے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رمیش کی امپورٹڈ کار تک پہنچ گئے ۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور آناً فاناً میں کلب کے کمپونڈ سے باہر نکل گئی ۔

سڑک پر بجلی کے کھمبے پر لگے بلب تاریکی کو دور کرنے کی ناکام سعی کر رہے تھے ۔ بارش شروع ہوگئی تھی امپورٹڈ کار اندھیری سڑک پر تیزی سے دوڑی چلی جارہی تھی ۔ راستہ سکنڈوں میں طے ہورہا تھا ۔ ادھر

دن تمام فٹ پاتھ پر بیٹھی جوان اور معذور بھکارن اپنے بوجھل قدموں سے سڑک عبور کر رہی تھی ۔ آج وہ بہت رات تک یہاں بیٹھ گئی تھی ۔ بارش کی وجہ سے اسے بھیک نہیں ملی تھی ۔ زمانے کا یہ عجیب تضاد تھا کوئی اسی سڑک پر رینگ رہا تھا اور کوئی اسی سڑک کو لمحوں میں طے کر رہا تھا ۔ رفتار حادثہ کا پیش خیمہ ہے ۔ رمیش کی تیز دوڑتی امپورٹڈ کار سے معذور بھکارن ٹکرا گئی فضا میں ایک چیخ گونجی رنجنا نے اپنی آنکھیں بند کرلیں ۔ سینما گھر کی گیٹ کھلی ۔ چوکیدار دوڑتا ہوا سڑک پر آیا ان کی نظروں کے سامنے سے امپورٹڈ کار گزر گئی ۔

اس رات رمیش کو بالکل نیند نہیں آئی ۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی صبح اس نے اخبار میں ایک سرخی دیکھی " جوان بھکارن کی کار حادثے سے موت پولیس کو کار اور مجرم کی تلاش "۔ رمیش گھبرا گیا ۔

رمیش شہر کے ایک بڑے کاروباری آدمی سیٹھ مہندر ناتھ کا اکلوتا لڑکا تھا ۔ اور کبھی مہندر ناتھ ایک معمولی ملازم تھا ۔ اس کی شادی بھی اسی کی حیثیت کی ایک معمولی عورت سے ہوئی تھی ۔ اس کو اس کی بیوی کی طرف سے بھی کچھ نہیں ملا تھا ۔ وہ اپنی محنت اور مشقت کے باوجود تنگ دستی کی زندگی گزار رہا تھا ۔ اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ مشکل سے پالتا تھا ۔ رمیش جب پیدا ہوا تو اس کی تنگ دستی اور بڑھ گئی اور جب رمیش کی ماں بیمار پڑی تو مہندر ناتھ کے پاس دواؤں کے لیے بھی پیسہ نہ تھا ۔ بیماری طویل ہوتی گئی اور دوا عنقا ۔ مہندر ناتھا کی لاچاری اور مجبوری نے اس کی بیوی کی جان لے لی اور وہ مر گئی ۔ اس نے دولت حاصل کرنے کی ٹھان

لی انسان جب ارادہ کرلیتا ہے تو راستہ نکل ہی آتا ہے چاہے وہ غلط ہو یا کہ صحیح ۔ جن دواؤں کے نہ ملنے سے اس کی بیوی کی موت ہوئی تھی مہندر ناتھ نے ان ہی دواؤں کا سہارا لیا ۔ اور ایک فارما سوٹیکل کمپنی PHARMA CEUTICAL COMPANY میں نوکر ہوگیا ۔ پھر اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے اسی کمپنی کا ڈسٹری بیوٹرDISTRIBUTER بن گیا ور بہت جلد اس نے نقلی دواؤں کا کاروبار شروع کردیا دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا دواؤں کا ایک کارخانہ کھول لیا ۔ کاروبار چل نکلا پھر وہ دو تین فیکٹریوں کا مالک بن گیا ۔ لوگ اسے سیٹھ مہندر ناتھ کہنے لگے ۔ اب اس کے پاس کالا دھن کافی جمع ہوگیا وہ معذوروں اور دھرم شالوں کو بھی چندہ دینے لگا ۔ اس کا لڑکا رمیش جوان ہوچکا تھا اور ایک نامور کالج سے B.A پاس کر کے اپنے باپ کے کاروبار سنبھالنے میں جٹ گیا ۔ رنجنا سے اس کی دوستی اسی کالج میں ہوئی تھی جہاں شہر کے دولت مند اور اونچے طبقے کے لڑکے لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں ۔ رنجنا اسی کالج سے انٹر سائنس پاس کر کے ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لے لی اور وہیںMEDICINE کے آخری سال میں آگئی ۔ اس کا باپ پولیس کا ایک انسپکٹر تھا اور اپنی محنت اور صلاحیت سے اب A . C . P بن گیا تھا ۔

اس بھکارن کے حادثے اور اخبار کی سرخی پڑھنے کے بعد رنجنا رمیش سے بہت کم ملنے لگی ۔ آج شام رنجنا کے M.B.B.S پاس ہوجانے کی مسرت میں A.C.P کے گھر پر ایک پارٹی تھی ۔ جہاں ڈاکٹرس ، پولیس آفیسرس اور شہر کے صنعت کار سبھی جمع تھے ۔ رمیش بھی اس پارٹی میں مدعو

تھا۔ رنجنا اپنے دوست احباب کا ایک دوسرے سے تعارف کرا رہی تھی۔

" رمیش آپ سے ملو۔ ڈاکٹر راج .M.B.B.S F.R.C.S سیول سرجن سپنا ہاسپٹل CARDIOLOGIST (کارڈیولوجسٹ) اور یہ میرے پتا مسٹر کیلاش ورما A.C.P ۔ A.C.P کے شاندار ڈائننگ روم میں میوزک سسٹم پر بسم اللہ خاں کی شہنائی گونج رہی تھی ہر طرف ایک خاموشی کا ماحول تھا۔ چائے ، کیک ، پیسٹری اور مٹھائیاں پیش ہو رہی تھیں رمیش نے ڈاکٹر راج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا " ایک A.C.P اور اتنا ٹھاٹ معلوم ہوتا ہے کی اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہی ہے۔"

اس پر ڈاکٹر راج ہنس پڑا۔ پھر دونوں کرسیاں لے کر ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے۔

" ہاں تو آپ دل کے ڈاکٹر ہیں " رمیش نے کہا۔

" جی ہاں "

" اچھا ڈاکٹر صاحب " دل کے جذبات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

" رمیش صاحب انسانی جسم میں دل صرف ایک PUMPING STATION پمپنگ اسٹیشن ہے۔ جذبات اور خیالات کا تعلق تو اس کے دماغ سے ہوتا ہے۔" ڈاکٹر راج نے کہا۔

" تو انسانی جذبات کا دل سے کوئی تعلق نہیں ؟ "

" جی ہاں میں نے کہا نا جذبات کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے دل سے نہیں۔"

اتنے میں رنجنا ان دونوں کے لیے چائے لے آئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ اب دو ڈاکٹر اور ایک بیچارہ دوا فروش۔

" رمیش صاحب آپ بھی تو دل کی دوا بناتے ہیں " ڈاکٹر راج نے کہا۔ " وہ جو بیچتے تھے دوائے دل۔۔۔

شہنائی یکایک رک گئی۔ مہمان پارٹی سے رخصت ہونے لگے۔ رمیش نے محسوس کیا کہ رنجنا اس سے کچھ انجان انجان سی ہے۔

اب روز گرجے کے گھنٹے بجتے لیکن رنجنا کا فون نہیں آتا۔ رمیش کو فون کا برابر انتظار رہتا تھا۔ پھر بھکارن کا حادثہ اور اخبار کی سرخی اس کے ذہن کو کچوکے دینے لگی۔ ایک دن خود رمیش نے رنجنا کو فون کیا۔ رنجنا کی مدھر آواز ایک بار پھر رمیش کے کانوں میں گونجنے لگی۔

" ہیلو میں رنجنا بول رہی ہوں۔"

" رنجنا میں رمیش بول رہا ہوں۔ آج آرہی ہونا کلب "

" نہیں میں مصروف ہوں۔"

" کیا مصروفیت ہے۔"

" شاپنگ کے لیے جانا ہے۔"

" میں بھی ساتھ چلوں۔"

" نہیں۔ ڈاکٹر راج میرے ساتھ ہیں۔" رمیش پر بجلی سی گری۔

ڈاکٹر رنجنا اور ڈاکٹر راج کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ رمیش اس حادثہ سے اور رنجنا کی بے اعتنائی سے پریشان رہنے لگا۔ کاروبار دھیرے دھیرے ٹھپ ہونے لگے۔ پولیس بھکارن کے قاتل کی جستجو میں لگی رہی۔ حادثے

کے مقام پر چھان بین کرنے سے امپورٹڈ کار کا پتہ چل گیا۔

ایک دن رمیش اور سیٹھ مہندر ناتھ دونوں اپنی آفس میں پریشان بیٹھے تھے فون کی گھنٹی بجی رمیش نے ریسیور اٹھایا۔ فون پر پولیس آفیسر کہہ رہا تھا کہ اس کو بھکارن کے حادثہ کی پوری معلومات ہوچکی ہیں۔ امپورٹڈ کار کا نمبر بھی مل چکا ہے۔ ساتھ ساتھ اس پر نقلی دوائیں بنانے کا الزام بھی ہے۔ سوپر فارما سوٹیکل کی فیکٹری پر پولیس کا پہرا کھڑا تھا دوسری طرف کلب میں آرکسٹرا والے کھڑے زوروں پر پاپ میوزک بجا رہے تھے۔ جواں جسم اس کی دھن پر تیزی سے تھرک رہے تھے۔ موسیقی اپنے شباب پر تھی۔ ڈاکٹر رنجنا اور ڈاکٹر راج باہوں میں باہیں ڈالے جھوم رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے آرکسٹرا خاموش ہوگیا۔ ایک بار اسی جگہ اسی لان پر راج اور رنجنا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ زندگی کی حقیقتوں کی باتیں۔ اپنے مستقبل کی باتیں A.C.P مسٹر کیلاش ورما وہاں پہنچے اور اپنے دوستوں سے ڈاکٹر راج کا تعارف کرانے لگے۔ " یہ ہیں ڈاکٹر راج۔ رنجنا کے ہونے والے پتی اور میرے ہونے والے داماد۔" یکایک آرکسٹرا پھر بج اٹھا۔ عورت پھر حسین عورت جس کو جب چاہے اپنا گرویدہ بنالے۔ نہ جانے کتنے رمیش رنجنا پر جان چھڑکتے تھے۔

رمیش کی سوپر فارما سوٹیکل آفس میں پولیس افسر رمیش سے سوال و جواب کر رہا تھا۔ رمیش بوکھلا گیا تھا۔ سیٹھ مہندر ناتھ پر دل کا دورہ پڑا رمیش اپنی امپورٹڈ کار میں اس کے پتا کو لے کر سپنا ہاسپٹل پہنچ گیا۔ پولیس اس کے ساتھ تھی۔

ڈاکٹر راج نے سیٹھ مہندر ناتھ کے چہرے پر فوراً آکسیجن ماسک چڑھا دیا ۔ مہندر ناتھ ڈاکٹر راج اور رمیش کے درمیا پلنگ پر پڑا آکسیجن ماسک کے ذریعے سانس لے رہا تھا ۔ سانس چلنے کی آواز مشین سے برابر آرہی تھی ۔ یکایک آواز رک گئی ۔ رمیش نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سرکو تھام لیا ڈاکٹر راج اپنا سر جھکائے کھڑا رہا ۔ شام ہوگئی تھی ۔ رات کے سیاہ بادل رمیش کی زندگی پر چھا گئے تھے ۔

دوسری شام کیلاش ورما کا بنگلہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا ۔ ادھر شمشان گھاٹ میں سیٹھ مہندر ناتھ کی چتا کی آگ دہک رہی تھی ۔ رمیش کے ساتھ کھڑا پولیس افسر چتا کے جلنے کا انتظار کر رہا تھا ۔ دور فضا میں گرجے کے گھنٹوں کی مغموم صدا گونج رہی تھی ۔ چھ بج رہے تھے ۔

○●○

"صلیب ایک نشانی"

گرجے کے گھنٹے رک رک کر بج رہے تھے گھنٹوں کی یہ آواز مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھی ۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان گھنٹوں کا اس طرح رک رک کر بجنا کیا معنی رکھتا ہے ۔ گھنٹوں کی آواز سے بہت دور چلے جانے کے باوجود اس کے ذہن میں وسوسے جنم لے رہے تھے ۔ اس نے ایک دن پہلے ہی ریٹا کو بڑی کرب ناک حالت میں نرسنگ ہوم میں دیکھا تھا ۔

سڑک پر موٹروں کے ہارن لاریوں اور بسوں کی تکلیف دہ آوازیں آٹو رکشاؤں کا بے تحاشہ دوڑنا ۔ وہ بہت پریشان تھا ۔ وہ اس وقت مکمل سکون چاہتا تھا ۔ اس کے قدم پرسیس PERCY'S بار کی طرف اٹھ گئے اور یہی وہ جگہ تھی جہاں اس کو مکمل سکون مل سکتا تھا ۔

اس کے آگے وہسکی کا گلاس رکھا تھا اور وہ اس کا ایک ایک گھونٹ لے رہا تھا ۔ وہ اتنا پی چکا تھا کہ بار کی دیوار پر اسے وہی منظر نظر

آنے لگے جو اس کی ذہن میں گھوم رہے تھے ۔

اس کا دوست ریاض ملک سعودی ایرلائینس میں گرونڈ انجنیر کے عہدے پر فائز تھا ۔ وہ چھٹی پر اپنے وطن لوٹ رہا تھا ۔ اپنے وطن لوٹنے کے لیے اسے ایک بڑے شہر کے ایک ایر پورٹ سے دوسری فلائیٹ لینی تھی ۔ ایرلائینس والوں نے اعلان کیا کہ طیارے میں کسی تکنیکی خرابی کے باعث فلائیٹ میں تاخیر ہوگی ۔ ایرلائینس کے انتظامیہ نے مسافروں کے ٹھہرنے کا انتظام ہوٹل عالیشان انٹرکوٹینینٹل میں کردیا ہے ۔ ایرلائینس کا کوچ ریاض ملک کو لیے ہوٹل عالیشان پہنچی ۔

ہوٹل عالیشان حقیقت میں عالیشان تھی ۔ اس کے RECEPTION پر بیٹھی ریٹا نے RECEPTION COUNTER کو اور زیادہ آرائیشی بنا دیا تھا ۔ ریٹا حسین تھی ۔ جوان تھی ۔ اس کے دل کش قدوخال ہوٹل میں ہر آنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرلیتے ۔ اس کا معصوم بھولا چہرہ اس کی معصومیت کی غمازی کر رہا تھا ۔ حقیقت میں وہ معصوم تھی ۔ ریاض ملک بھی پہلی ہی نظر میں ریٹا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ وہ کچھ دیر خاموش RECEPTION پر کھڑا رہا ۔ ریٹا کی مدھر آواز نے اس کی مدہوشی کو توڑا ۔

"سر یہ آپ کے کمرہ نمبر ۳۰۲ کی چابی ۔"

ریاض ملک نے کاونٹر پر سے چابی اٹھالی اور انگلی میں گھماتا ہوا وہیں کھڑا رہا ۔

"سر آپ کا کمرہ اوپر ہے ۔ آپ کا سامان پہنچا دیا گیا ہے ۔"

اب تو ریاض ملک اوپر جانے پر مجبور ہوگیا ۔

کمرہ نمبر ۳۰۲ رشکِ فردوس بنا ہوا تھا ۔ بھینی بھینی خوش بو ، دھیمی دھیمی موسیقی ، نرم نرم قالین ، نہایت صاف آرام دہ بستر۔ یہ ساری آسائش کی چیزیں ریاض ملک کی بے چینی کو دور نہ کرسکیں ۔ وہ نہا دھو کر رات کے کھانے کے لیے نیچے آیا ۔ ریٹا کو ایک بار پھر دیکھنے وہ بے چین تھا ۔ ڈائیننگ ہال کا راستہ RECEPTION سے ہوکر گزرتا تھا ۔ اس نے ریٹا پر ایک نظر ڈالی وہ اس وقت فون کالس میں الجھی ہوئی تھی اس لیے ریاض ملک ریٹا سے بنا بات کیے ڈائیننگ ہال چلا گیا ۔

ہوٹل عالیشان کا یہ نیم روشن ڈائیننگ ہال آرکسٹرا کی مدھر سروں سے گونج رہا تھا ۔ میزوں پر صاف شفاف ٹیبل کلاتھ بچھے ہوئے تھے ۔ جگمگاتے گلاس چمکتے کانٹے چمچے میزوں کی زینت بنے ہوئے تھے ۔ ہال کا ماحول بڑا پُرکیف تھا ۔ لیکن ریاض ملک اس ماحول سے بے نیاز ریٹا کے خیالوں میں گم ۔ ڈائیننگ ہال سے واپسی پر وہ کچھ دیر کے لیے RECEPTION پر رکا مسکرا کر ریٹا کو GOOD NIGHT کہا اور اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا ۔

رات کافی ہوچکی تھی ۔ ریاض ملک کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی ۔ رات تمام اس کی آنکھوں میں ریٹا کا حسین معصوم چہرہ گھومتا رہا ۔ وہ صبح دیر تک سوتا رہا اور جب اٹھا تو اس کی زندگی نے ایک کروٹ لی ۔ اس نے ریٹا کو اپنانے کی ٹھان لی ۔

ریاض ملک نے اپنی صبح کی فلائیٹ کینسل کردی اور کچھ دنوں کے لیے یہیں ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا ۔ اب وہ جب بھی RECEPTION

سے گزرتا ریٹا سے کوئی نہ کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا ۔ ریٹا بھی بہت جلد اس سے مانوس ہوگئی ۔ ریٹا نے بتلایا کہ وہ حال ہی میں اس ملازمت پر آئی ہے ۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی ہے ۔ اس کے ماں باپ گوا میں رہتے ہیں ۔ جو یہاں سے بہت دور ہے ۔ اس کو یہاں اچھی تنخواہ ملتی ہے اس لیے وہ اپنا شہر چھوڑ کر یہاں آئی ہے ۔

ریاض ملک نے اپنے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے ۔ لیکن ریٹا اس کا VISITING CARD پڑھ کر جان گئی تھی کہ ریاض ملک ایک بڑے عہدے پر فائز ہے ۔ روز روز کی ملاقاتوں نے ریٹا کو بھی متاثر کیا پھر ریاض ملک کی شخصیت نے اسے اس کا گرویدہ بنادیا ۔ اب ان دونوں کی ہر شام شہر سے دور پکنک رسٹوراں میں گزرا کرتی ۔

ایک شام جب وہ دونوں پکنک رسٹوراں میں بیٹھے چائے کے گھونٹ لے رہے تھے ۔ ریاض ملک نے کہا ۔

" ریٹا اب میں جو بات کہنے والا ہوں اس کا تعلق تمھاری اور میری زندگی سے بہت گہرا ہے ۔"

ریٹا کچھ کچھ سمجھ گئی پھر بھی مجسم حیرت بنی ریاض ملک کو تکتی رہی

" ریٹا میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔"

یہ سن کر ریٹا کا چہرہ گلنار ہوگیا ۔ اس نے کہا

" ریاض صاحب ! میں کرسچن ہوں اور اپنا مذہب چھوڑنا نہیں چاہتی ۔"

"ہاں میں جانتا ہوں ۔"

"پھر بھی"

"ہاں پھر بھی"

"اور آپ کے ماں باپ ؟"

"میں انھیں راضی کرلوں گا"

ریٹا نے سوچا کہ اس کو ریاض ملک سے زیادہ چاہنے والا کوئی نہیں مل سکتا اس نے مسکرا کر جواب دیا ۔

"میں بھی اپنے ماں باپ کو راضی کرلوں گی ۔"

پکنک رسٹوراں کے باہر فضا بڑی پُرکیف تھی ۔ موسم خوش گوار تھا ۔ گرجے کے گھنٹے شام کے سہانے پن میں اضافہ کر رہے تھے ۔ گھنٹوں کی آواز کے ساتھ ہی ریٹا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا THE FATHER - THE SON AND THE HOLY SPIRIT پھر دونوں خاموش سڑک پر بہت دور تک چلتے رہے ۔ آسمان پر ستارے جگمگانے لگے ۔ ریاض ملک نے ریٹا کو اپنے اور قریب کرلیا ۔ اور اپنے پیاسے ہونٹ ریٹا کے رس بھرے ہونٹوں پر رکھ دیئے ۔ ایک طویل بوسہ فضا میں تحلیل ہوگیا ۔

INDIAN AIR LINES کا طیارہ ریٹا اور ریاض کو لیے ایرپورٹ پر اتر رہا تھا ۔ ایرپورٹ پر ریاض کے ماں باپ ، رشتے دار ، دوست احباب سب ہی جمع تھے ۔ ریاض اور ریٹا اتر پڑے اور جب وہ ریٹا کا ہاتھ تھامے ایرپورٹ سے باہر نکلا تو ماں باپ پریشان ۔ خاندان والے

حیران ایک دوسرے کو تکنے لگے ۔ اس بھیڑ میں ریاض ملک کا ایک خاص اور گہرا دوست بھی موجود تھا ۔ ریاض ملک نے ریٹا کو اپنے گہرے دوست سے ملاتے ہوئے کہا "میں نے اپنا شریک حیات چن لیا ہے ۔"

ریاض کا یہ دوست ایک آزاد خیال ، آزاد مشرب نوجوان تھا ۔ اس کا کوئی مذہب نہیں تھا ۔ اس کی کوئی عبادت گاہ نہیں تھی ۔ وہ ہر عبادت گاہ کا احترام کرتا تھا ۔ پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ ریٹا اور ریاض میں کیا بات مشترک ہے ۔ جب کہ دونوں کی شناخت الگ الگ ہے ۔ دونوں کے مذاہب الگ الگ ہیں ۔ دونوں کی عبادت گاہیں الگ الگ ہیں ۔ دونوں کے رسم و رواج الگ الگ ہیں ۔ ایک جوتا پہن کر اور ٹوپی اتار کر اپنی عبادت گاہ میں جاتا ہے ۔ تو دوسرا جوتا اتار کر اور ٹوپی پہن کر اپنی عبادت گاہ میں جاتا ہے ۔ ایک کے پاس شراب بری چیز ہے تو دوسرے کے پاس اچھی یہ زندگی کا کتنا بڑا تضاد ہے ۔ وہ سوچنے لگا کہ پھر وہ کیا ہے جو ان دونوں میں مشترک ہے ۔ اس کے دل سے آواز آئی ۔ محبت صرف محبت ۔ جو میناروں سے بلند ہے ۔ دیوی دیوتاؤں سے پوتر ہے ۔ شرائین سے مقدس ہے ۔

جب ریاض کے ماں باپ کو پتا چلا کہ وہ ریٹا سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ برہم ہوگئے ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ریاض ریٹا سے شادی کرے اور ایک غیر مذہب کی لڑکی کو اپنے خاندان میں شامل کرے ۔ وہ لوگ اپنے مذہبی رویے میں زیادہ کٹر تھے ۔ اور ادھر ریاض ریٹا سے شادی کرنے پر تلا ہوا تھا ۔ جب ریاض کو اس کے ماں باپ کی رضا مندی نہ ملی

تو وہ ریٹا کو لے کر سیدھے اپنے دوست کے گھر پہنچا ۔ یہ اس کا وہی دوست تھا جو بہت فراخ دل اور وسیع النظر کا حامی تھا وہ ایک اونچی سوجھ بوجھ رکھتا تھا ۔ وہ دل کو مندر اور دماغ کو دیوتا مانتا تھا ۔ اس نے ان دونوں کا بڑا پُر تپاک خیر مقدم کیا ۔ اور تینوں سیدھے MARRIAGE REGISTERATION OFFICE پہنچے ۔ پھر ریٹا اور ریاض کی شادی ہوگئی ۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا لیا ۔ ریاض کے دوست نے ان دونوں کے گلے میں پھول مالا ڈال دی ۔

وہ شام بڑی حسین و دل فریب تھی ۔ گرجے کے گھنٹے دعوتِ عبادت دے رہے تھے ۔ ریٹا ، ریاض اور اس کے دوست کو لے کر گرجا گھر پہنچی ۔ تینوں اندر گئے ریٹا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے اپنے آپ کو شرین کے آگے جھکا دیا اور گھٹنوں پر ٹھہر کر بڑی دیر تک محوِ عبادت رہی ۔ پاس کھڑا ریاض ماحول کے اس تقدس پر محوِ حیرت تھا ۔ سامنے صلیب پر لٹکا یسوع مسیح کا مجسمہ پیغمبرِ نجات بنا رہا ۔

گرجا گھر سے تینوں ایک بار و رسٹوراں پہنچے جہاں ریاض کے دوست نے ان کی شادی کی خوشی میں ڈنر ترتیب دیا تھا ۔ ڈنر سے پہلے اس نے ریٹا کے لیے بئیر BEER ریاض کے لیے کول ڈرنک اور اپنے لیے وہسکی کا آرڈر دیا ۔ یہ تینوں کردار ایک مثلث کے تین زاویے تھے ۔ اس کے نقطے پر ریٹا پیکرِ حسن دوسرے پر ریاض پروانہ ء محبت اور تیسرے پر اس کا دوست مجسم خلوص ۔ یہ تینوں کردار ایک دوسرے سے مربوط تھے ۔ تینوں کے گلاس ایک دوسرے سے ٹکرائے ایک چھنا کا ہوا ، محبت کا ،

خلوص کا، مسرت کا۔

رات بڑی ہو چکی تھی ریٹا اور ریاض اپنے ایک الگ فلیٹ میں آگئے۔ رات حسین تھی، محبت کی رات وصال کی رات جو بہت جلد گزر گئی، ریاض اور ریٹا کچھ دنوں یہاں رہ کر گوا چلے گئے۔ گوا میں ریٹا کے ماں باپ بھی اس شادی سے زیادہ خوش نہ تھے۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ ایک ماہ پر لگا کر اڑ گیا لیکن ریٹا کی جھولی میں خوشیاں بھر گیا۔ ریٹا ماں بننے والی تھی۔ ریاض کو اب ریٹا کے آرام کا زیادہ ہی خیال رہنے لگا۔ اس نے ریٹا کو نوکری سے استعفیٰ دلا دیا اور اس کے ماں باپ کے ساتھ اپنے شہر لے آیا اور اپنے فلیٹ میں ٹھہرا دیا۔ وہ ان لوگوں کے لیے سارے انتظامات کر کے اپنی ڈیوٹی پر رجوع ہونے سعودی چلا گیا۔

دن گزرتے گئے۔ وقت کے سمندر میں موجیں اٹھتی رہیں۔ ریٹا، ریاض کی یاد میں اور آنے والے مہمان کی خوشی میں دن گزارنے لگی۔ لیکن کچھ دنوں بعد ریٹا نے محسوس کیا کہ اس کو چکر آرہی ہے اور اس کی کوکھ میں پلنے والے بچے کی حرکت بند ہوگئی ہے۔ اس نے یہ بات اپنی ماں کو بتائی۔ ماں کی بوڑھی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھا کہ ریٹا نیلی پڑتی جارہی ہے۔ وہ فوراً اپنی بیٹی کو لیے نرسنگ ہوم پہنچی اور ساتھ ہی ریاض کو فون بھی کردیا کہ وہ جلد از جلد چلا آئے۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے لیے، Scan کیا اور فوراً ریٹا آپریشن تھیٹر پہنچا دی گئی۔ پھر ڈاکٹروں نے بتایا کہ ریٹا کا بچہ اس کے پیٹ میں مر چکا ہے اور زہر ریٹا کے سارے جسم میں سرایت کرچکا ہے۔ ان لوگوں نے نرسنگ ہوم پہنچنے میں دیر کردی ہے۔ ڈاکٹروں

کی ساری کوششوں کے باوجود ریٹا بچ نہ سکی اور ریاض پہنچ نہ سکا۔

ریاض کے دوست نے وہسکی کا آخری گھونٹ لیا۔ بار کی دیوار پر کے سارے مناظر دھندلا گئے۔ وہ سڑک پر نکل آیا۔ اس کا وسوسہ حقیقت میں بدل گیا۔ سڑک پر ریٹا کے تابوت کی گاڑی چلی جارہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اپنے ہاتھوں میں شمع لیے گاڑی کے آگے آگے چل رہے تھے۔ ایرپورٹ پر طیارے کی روشنی پڑ رہی تھی۔ جس سے ریاض آرہا تھا۔ تابوت کی گاڑی گریو یارڈ پہنچی طیارہ ایرپورٹ پر اتر گیا۔ ریٹا کا تابوت زیرِ زمین رکھ دیا گیا۔ ریاض ایرپورٹ سے سیدھے نرسنگ ہوم پہنچا۔ دیر ہوچکی تھی۔ وہ وہاں سے تیزی سے گریو یارڈ پہنچا دیر ہوچکی تھی۔ اس کا دوست وہاں تنہا کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ اب وہاں کچھ نہ تھا۔ رہ گئی تھی بس صلیب ایک نشانی۔

○●○

"زندگی کی کتاب"

سورج کہیں دور غروب ہورہا تھا ۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا ۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ اندھیرا اجالے کو نگل جائے گا اور پھر ایک نہ ختم ہونے والی رات اپنے دامن میں ساری کائنات کو لپیٹ لے گی ۔ رات پھر سنّاٹا ۔

عرفان ایک بوسیدہ حویلی کے اندھیرے کمرہ میں تنہا بیٹھا شراب کے گھونٹ کے ساتھ اپنی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق الٹ رہا تھا اور اپنی ماضی کا جائزہ لے رہا تھا ۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا ۔ کتنا خوب صورت اور دلچسپ تھا اس کا وہ لڑکپن ۔ اسے یاد آیا وہ کس طرح مدرسہ جایا کرتا تھا اور گڑی کا وہ مدرسہ جہاں وہ پڑھا کرتا تھا کتنا اچھا تھا ۔ اسے وہ گرجے کے گھنٹوں کی آواز سے کتنا لگاؤ تھا ۔ بارہ بجتے ہی گرجے کے گھنٹے بج اٹھتے ساتھ ہی مدرسے کی گھنٹی بجتی سارے لڑکے شور مچاتے اپنی جماعتوں سے باہر نکل پڑتے ۔ عرفان بھی باہر آجاتا ۔ باہر اس کا نوکر ٹفن لیے اس کا انتظار کرتا ۔ پھر دونوں مقدس ماں کے مجسمے کے

سامنے بیٹھ جاتے۔ عرفان اپنا کھانا شروع کرتا وہ بار بار اس مقدس ماں کے مجسمے کو گھورتا اس پر اس کا نوکر اس کو ٹوک دیتا تو وہ کہتا " دیکھو عبداللہ یہ مجسمہ کتنا خوبصورت ہے۔ کس طرح ایک ماں اپنے ننھے سے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے بھی اسی طرح اپنے سینے سے لگا لے گی جس طرح اس نے اس خوب صورت اور چھوٹے بچے کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ مدرسے کی گھنٹی بجتی لڑکے اپنی اپنی جماعتوں کو چلے جاتے عرفان بھی اپنی کلاس میں چلاجاتا لیکن کلاس میں اس کا دل نہیں لگتا اور وہ مقدس ماں اور اس کے بچے کی خوب صورتی میں کھویا رہتا۔

دن گزر جاتے گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوجاتیں۔ عرفان اپنے گاؤں اپنے ماں باپ کے پاس چلاجاتا۔ یہ گاؤں اس کے لیے بڑا پُر کشش تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ اس کا وطن تھا اور یہاں اس کے آباواجدا کی زمین۔ پھر اس گاؤں میں کیا کچھ نہ تھا۔ ہر طرف سرسبز لہلہاتے کھیت، آم اور املی کے ان گنت درخت ان درختوں میں گھری ایک وسیع و عریض درگاہ جس سے ملحقہ ایک خوب صورت اور سنگ بستہ باولی، درگاہ کے باب الداخلہ پر ایک اونچی کمان جہاں سے صبح ہی صبح نوبت کی سریلی آواز سنائی دیتی۔ ساتھ ہی گاؤں کے پنگھٹ پر موٹ چلنے شروع ہوجاتے گویا زندگی شروع ہوجاتی پنگھٹ پر چلتے موٹ کے چرخوں سے ایک موسیقی سنائی دیتی۔ پھر راستوں پر بنڈیوں کے پہیے گھومتے ان میں بھی ایک موسیقی۔ بیلوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیاں بج

اٹھتیں ۔ صبح ہی صبح ساری فضا سریلی آوازوں سے گونج اٹھتی ۔ سارا ماحول بڑا پُر مسرت بڑا دل کش ہوجاتا عرفان اس ماحول میں کھوجاتا وہ دن بھر درگاہ کی سنگ بستہ باولی میں تیرتا پانی سے لطف اندوز ہوتا ۔ پھر شام ہوجاتی ۔ شام میں اس کی نانی اس کو قصے کہانیاں سناتی عرفان کو کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا وہ اپنے ذہن میں بھی نئی نئی کہانیاں تشکیل دیتا ۔

وقت کا دریا تیزی سے بہا چلا جارہا تھا ۔ عرفان کی کتاب زندگی کا یہ باب جلد ہی ختم ہوگیا ۔ اس کی زندگی کی کتاب کا ایک اور باب اس کی نظروں کے سامنے آگیا لڑکپن گیا ۔ مسیں بھیگنے لگیں ، طبیعت میں لاوبالی پن آگیا وہ میٹرک پاس کرچکا تھا اور ایک کالج میں داخلہ لے چکا تھا ۔ کالج کا ماحول بڑا رنگین تھا ۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی پڑھ رہی تھیں ۔ عرفان کے لاوبالی پن نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اس کو کالج کے کورس کی کتابوں سے زیادہ دوسری کتابوں سے دل چسپی تھی ۔ بحث مباحثہ کرنا اس کا وطیرہ بن گیا ۔ اسی زمانے میں اس نے فرائڈ ، آسکر وائلڈ ، کارل مارکس نتشے ، برونڈ رسل کو پڑھ ڈالا ۔ مشہور شاعروں کے کلام ۔ ادیبوں اور دانش وروں کے کتابچے اور رسالے اس کی نظر سے گزر چکے تھے ۔ تب اس نے کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کیے ۔

ایک دن جب کہ وہ ایک انگریزی رسالے کے سوال / جواب کا کالم پڑھ رہا تھا اس کی نظر ایک سوال پر رک گئی ۔ سوال تھا :

ARE EXAMINATIONS REALLY A TEST OF MERIT ?

اور اس کا جواب تھا :

IT IS A MILESTONE WHERE IDIOT STOPS LEARNING

عرفان نے سوچا کہ یہ حقیقت ہے۔ بعض طالبِ علم میٹرک پاس کرکے پڑھنا ختم کردیتے ہیں۔ کچھ طالبِ علم بی۔ اے پاس کر کے ملازمت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور شاذ ہی ایم۔ اے اور اس کے آگے پڑھتے ہیں پھر ان کا تعلیمی سلسلہ ختم ہوجاتا ہے اور کتاب ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ کتاب جو اعلیٰ ہے۔ کتاب جو مقدس ہے۔ عرفان کا کتاب سے گہرا ربط تھا اس نے کتاب کو سنبھال لیا اور امتحان کو چھوڑ دیا۔ اس نے لکھنا شروع کیا۔ وہ بی۔ اے پاس نہ کرسکا۔ اس کی قابلیت اپنی جگہ پر تھی۔ اس کا مرتبہ اپنی جگہ پر تھا لیکن دفتروں کا عہدہ اور تھا۔ اس کی ساری جستجو کے باوجود اسے کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہ مل سکی کیوں کہ وہ گریجویٹ نہیں تھا۔ QULIFIED نہیں تھا۔ کتاب رتبہ اور شہرت تو دلاسکتی ہے لیکن عہدہ نہیں۔

اب عرفان کی زندگی کا ایک دوسرا باب کھلا۔ رعنا عرفان کی زندگی میں آگئی۔ رعنا عرفان کے پڑوس میں رہتی تھی عرفان کے افسانوں کی شہرت کالج سے نکل کر پڑوس کے گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ ایک شام جب گرجے کے گھنٹے چھے بجنے کا اعلان کررہے تھے رعنا ٹہلتی ٹہلتی عرفان کی حویلی میں داخل ہوئی عرفان صحن میں کرسی ڈالے بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اس کی نظر رعنا پر پڑی وہ بے ارادہ اٹھ کھڑا ہوا دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔

روز شام گرجے کے گھنٹے چھے بجنے کا اعلان کرتے رعنا عرفان کی

حویلی میں داخل ہوتی عرفان صحن میں ٹہلتا رہتا دونوں بیٹھ جاتے باتیں شروع کرتے زندگی کی مسائل کی باتیں۔ انسان کے دکھ درد کی باتیں " عرفان صاحب آپ لکھتے بہت اچھا ہیں۔" آپ کا افسانہ " پھول جو مرجھا گیا " بہت عمدہ ہے لیکن کیا آپ زندگی کی حقیقتوں پر بھی روشنی ڈال سکتے ہیں ؟ " عرفان نے کہا " میرے پاس زندگی کا مفہوم محبت ہے۔ انسان سے محبت۔ انسانیت سے محبت، محبت تکمیل حیات ہے۔" عرفان کی آنکھیں اس کے جذبات کی غمازی کررہی تھیں۔ " محبت ایک نہ مرجھانے والا پھول ہے اور پھول انسانی زندگی کی ہر منزل کے ساتھی ہیں۔ گھوارے سے لے کر مرقد تک۔" عرفان اب ذرا زیادہ جذباتی ہوگیا تھا اس نے کہا " کیا آپ جانتی ہیں کہ پھولوں کو مسل دیا جائے توکیا ہوتا ہے ؟ " کیا ہوتا ہے " رعنا نے پوچھا۔

" اس سے عطر نکل آتا ہے اور ساری فضا میں خوش بو پھیل جاتی ہے۔ محبت صرف محبت " رعنا ہنستی رہی اس نے پوچھا " اچھا عرفان صاحب پھر عبادت کیا ہے ؟

عرفان نے کہا " محبت زندگی کا ایقان ہے عبادت اور موت کا وسوسہ میں صرف محبت جانتا ہوں۔" عرفان نے دھیمی اواز میں کہا سمجھیں میری گلِ رعنا " اور رعنا کے لبوں پر ہلکاسا تبسم آگیا۔ دونوں کی محبت کاسلسلہ شروع ہوگیا ان کی محبت کا سمندر ٹھاٹیں مارنے لگا پھر رعنا عرفان کی زندگی میں آگئی اس کی شریکِ حیات بن گئی۔ دونوں زندگی کے ناہموار راستوں پر چل پڑے لیکن رعنا زیادہ دور تک نہ چل سکی وہ ایک

مہلک مرض کا شکار ہوگئی ۔ ہر دوا ناکام ، ہر اعلاج لاحاصل ۔ موت اس کا تعاقب کر رہی تھی اور ایک دن موت کے ظالم ہاتھوں نے رعنا کو اپنے شکنجے میں لے لیا ۔ رعنا جو عرفان کی حاصلِ حیات تھی ۔ اس کی زندگی تھی ، اس نے سب کچھ کھو کر رعنا کو پایا تھا ۔ رعنا کے نازک اور گلابی ہونٹ عرفان کی نظروں کے آگے گھومنے لگے اس نے شراب کا بوتل اپنی گلاس میں خالی کر ڈالا اور گلاس کو اپنے ہونٹوں سے یوں چسپاں کردیا جیسے اس نے رعنا کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیے ہوں ۔ اگر انسان اپنی ساری صلاحیتیں اپنی کاوشوں اور اپنی زندگی کی ساری کشمکش ایک اور صرف ایک نقطہ پر مرکوز کردے اور پھر وہی نقطہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوجائے تو اس کا کیا انجام ہوسکتا ہے کیا قدرت کا یہی نظام ہے ؟ کیا یہی اس کا عدل ہے یہ سوچتے سوچتے عرفان کا سر بھاری ہوگیا اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا اور کب صبح ہوگئی اس کو خبر بھی نہ ہوئی ۔ جب صبح عرفان کے دوست شہباز نے اس کو جگایا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اس نے شہباز کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا شہباز کمرے میں خالی بوتل اور جلتی ہوئی قندیل کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ عرفان رات دیر گئے تک پیتا رہا ۔ شہباز نے کہا " اتنی مت پیو " عرفان " شہباز لوگ غریبوں کو کھلاتے ہیں بھکاریوں کو کپڑا دیتے ہیں لیکن خود ان کی روحیں بھوکی اور فاقہ کش ہیں " عرفان نے کہا ۔

" تم نے پھر آسکر وائلڈ کا فلسفہ چھیڑ دیا عرفان ۔"

" شہباز یہ فلسفہ نہیں حقیقت ہے اور لوگ اس برہنہ حقیقت

پر دبیز پردے ڈال دیتے ہیں کیوں کہ وہ لوگ سطحی ہوتے ہیں ۔ تصنع کو اپنا لیتے ہیں کڑوی حقیقتوں کا سامنا نہیں کرسکتے ۔ شہباز نصیحت تو ہر کوئی کرسکتا ہے لیکن کسی کی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھنا ان کے لیے آسان نہیں ۔ بعض وقت زندگی کے بڑے بھیانک روپ سامنے آجاتے ہیں ۔ شہباز تم میرے دوست ہو ۔ کیا تم نے میری زندگی میں کبھی جھانکا ہے ؟ " ہاں عرفان میرے دوست میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں ۔ انسان اتنا برداشت نہیں کرسکتا ۔"

پھر دونوں باہر ناشتے کے لیے اورینٹ رستوران جا پہنچے جہاں اس شہر کے شاعر، ادیب اور دانش ور جمع ہوتے تھے ۔ شہباز نے بیرے کو بلا کر ٹوسٹ اور آملیٹ کا آرڈر دیا ۔ وہ دونوں ناشتہ ختم کر کے چائے پی رہے تھے کہ سہیل وہاں آگیا ۔ شہباز نے سہیل کو چائے پینے کو کہا ۔ سہیل نے نفی میں جواب دیا ۔ اس پر عرفان نے کہا " وائلڈ کہتا ہے

DON'T RESIST THE TEMPTATION YEILD TO IT, OTHERWISE YOUR SOUL WILL GROW SICK

سہیل ایک پڑھا لکھا سلجھی ہوئی سوجھ بوجھ کا نوجوان تھا ۔ اس نے کرسی کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا ۔ " عرفان صاحب آپ کا وائلڈ انسان کو ذرا بھٹکا دیتا ہے ۔"

" بالکل نہیں " عرفان نے کہا " وہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھتا ہے ۔ کیا یہ سچ نہیں ؟

"THERE IS NOTHING GOOD OR BAD, THINKING MAKES IT SO."

سہیل نے کہا " کچھ حد تک ۔ پوری طرح نہیں ۔ زندگی کی کچھ اعلیٰ قدریں ہیں جن کو کبھی جھٹلایا نہیں

جاسکتا " اس پر عرفان جذباتی ہوگیا اور پھر اس نے کہا :
" قدریں کوئی اعلیٰ ہوتی ہیں نہ ادنیٰ ، زندگی کے تلخ حقائق ان سب کا ملیا میٹ کردیتے ہیں ۔" اب گفتگو میں تلخی آرہی تھی اس لیے شہباز نے گفتگو کا رخ بدل دیا پھر گفتگو عرفان کے اندھیرے کمرے اور اس کی حویلی پر رک گئی ۔

عرفان کے والد ایک زمیں دار تھے اور اپنے گاؤں کی ساری جائیداد بیچ کر شہر میں ایک قدیم حویلی جس کی اراضی کافی وسیع تھی خرید لی تھی ۔ عرفان اس کا اکلوتا لڑکا تھا اور ان کے انتقال کے بعد یہ حویلی عرفان کو مل گئی تھی ۔ عرفان اپنی ساری قابلیت کے باوجود بےروزگار رہا اسے کوئی موزوں ملازمت نہ ملی ۔ رفتہ رفتہ حویلی کی زمین بکنے لگی اور پھر باقی رہ گئی وہ حویلی اور عرفان کا اندھیرا کمرہ جس کی برقی لائن بھی اس بڑی حویلی کی بھاری بل ادا نہ کرنے پر منقطع کردی گئی تھی ۔ عرفان رات میں قندیل روشن کر لیتا جہاں اس کے دانش ور دوست اس کے نیم تاریک کمرے میں بیٹھتے اس روشن اور وسیع دنیا کے مسائل پر گفتگو کرتے اور کبھی کبھی وہسکی کا دور بھی چل جاتا ۔

ادھر کچھ دنوں سے عرفان پریشان اور مصروف نظر آنے لگا تھا اس قدیم حویلی کو منہدم کرنے کے منصوبے بنائے جارہے تھے اس کی جگہ ایک نیا COMPLEX تعمیر ہونے والا تھا ۔ عرفان COMPLEX کے بنانے والوں سے حویلی کے معاوضے اور شرائط پر گفتگو کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا تھا پھر ایک صبح حویلی منہدم ہونا شروع ہوگئی اور

دیکھتے ہی دیکھتے ساری حویلی اینٹ اور چونے کا ڈھیر بن گئی۔
COMPLEX کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور وہ دن بھی آگیا جب اس کی آخری منزل پر ایک رستوران کا INTERIOR DECORATION ہونے لگا اور وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی جو اس کام کو خوبصورتی سے انجام دے رہی تھی۔ اس کا نام شبانہ تھا۔

عرفان کو بھی COMPLEX کی تعمیر سے دلچسپی تھی کیوں کہ معاہدہ کے مطابق اس کو بھی یہاں ایک فلیٹ ملنے والا تھا اور جس کے مکمل ہونے کا اسے بے چینی سے انتظار تھا۔

ایک دن اسی زیرِ تعمیر COMPLEX میں عرفان کی ملاقات شبانہ سے ہوئی۔ ابتدائی ملاقاتیں رسمی گفتگو پر ختم ہوئیں پھر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ان کی بے تکلفی بڑھتی گئی۔ ایک شام عرفان نے شبانہ سے رعنا کا سارا واقعہ سنایا۔ واقعہ سنتے سنتے شبانہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کے دل میں عرفان کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی اس نے کہا " دیکھئے عرفان صاحب ایک چیز ٹوٹتی ہے تو دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ایک حویلی منہدم ہوتی ہے تو دوسری عمارت اس کی جگہ کھڑی ہوجاتی ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ شبانہ کے فلسفیانہ جملے اور اس کے جمالیاتی ذوق نے عرفان کو اس کے قریب کردیا اس کے جمالیاتی ذوق نے رستوران کی آرائش کو چار چاند لگادیئے۔ شبانہ کے خیالوں میں غرق عرفان وہاں سے نکل گیا۔

اب COMPLEX تیار ہوچکا تھا عرفان بھی اپنے نئے فلیٹ

میں منتقل ہوگیا تھا۔ رستوراں میں INTERIOR DECORATION کا کام پائے تکمیل کو پہنچ چکا پھر بھی شبانہ عرفان سے ملنے کے لیے اس کے فلیٹ میں آتی رہی۔

ایک شام گرجے کے گھنٹے چھے بجنے کا اعلان کررہے تھے۔ شبانہ عرفان کے فلیٹ میں داخل ہوئی دیر تک دونوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ نظریہ ٔ حیات پر فلسفہ موت پر اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ شبانہ نے بجلی کا سوئچ دبایا کمرہ روشن ہوگیا۔

○●○

"حیات کا رقص"

سورج جیسے قبرستان کو الوداع کہتے ہوئے رخصت ہو رہا تھا۔ اس کی آخری کرنیں قبرستان کو منور کیے ہوئے تھیں اور ان کرنوں کا سارا نور صرف ایک سفید سنگِ مرمر کی قبر پر مرکوز ہوگیا تھا جیسے وہ دکھلانا چاہتا تھا ان سرخ دمکتے ہوئے گلابوں کو اور اس عبارت کو جو قبر کے اس سفید کتبے پر سیاہی سے کندہ تھی۔

عالمِ شوق سے منھ موڑ کے جانا کیسا
موسمِ گل میں چمن چھوڑ کے جانا کیسا
شوقِ منزل میں سبک گام گزر جاتے ہیں
دیکھتا رہ گیا حسرت سے زمانہ کیسا
(محمود حزیںؔ)

عرفان کی نظریں اس عبارت پر جم گئیں ۔ اس کے منہ میں جلتا سگریٹ اپنی آخری منزلیں طے کر رہا تھا ۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ سارا قبرستان جل رہا ہے ۔ ساری کائنات جل رہی ہے کیوں کہ سگریٹ کی طرح آہستہ آہستہ اس کی ذات جل رہی تھی ۔ ذات اور کائنات ۔ کائنات اور ذات کیا یہ مختلف چیزیں ہیں ۔ کیا ان میں کوئی ربط ہے ۔ ذات کے بغیر کائنات کا وجود کیا معنی ؟ وہ وہاں تنہا بیٹھا اس فلسفے میں محو رہا ۔ سگریٹ سے جھڑتی راکھ قبرستان کی مٹی میں اس طرح مل رہی تھی جس طرح انسان خاک میں مل کر خاک ۔ اس کی ذات دفن ہوجاتی ہے ۔ اس کی شخصیت دفن ہوجاتی ہے ۔ جس طرح نوجوان رعنا دفن ہوگئی تھی ۔

۔ معمول کی طرح عرفان اس قبر کے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا ۔ آسمان کی سرخی سیاہی میں گھل گئی ۔ قبرستان پر تاریکی اور سنّاٹا چھا گیا ۔ اسی سنّاٹے میں اس نے ایک آواز محسوس کی جیسے یہ آواز اسی لحد سے آرہی ہو اور رعنا اس سے کہہ رہی ہو " عرفان جاؤ زندگی کے دھارے میں مل جاؤ اور حیات کے رقص میں شریک ہوجاؤ ورنہ تمھاری ذات تمھاری شخصیت ادھوری رہ جائے گی ۔" اس کے آگے وہ کچھ سن نہ سکا کیوں کہ یکایک تیز ہوائیں چلنے لگیں ۔ ہر طرف دھول اڑنے لگی ۔ ماحول غبار آلود اور وحشت ناک ہوگیا ۔ عرفان اس ماحول سے نکل کر آہستہ آہستہ آگے جانے لگا ۔ ہوائیں رک گئیں غبار چھٹ گیا لیکن رعنا کی آواز اس کا پیچھا کر رہی تھی ۔ " عرفان جاؤ زندگی کے دھارے میں مل جاؤ ۔" زندگی جو ایک جہدِ مسلسل ہے اور آواز جو شخصیت کی پہچان ہے ۔

عرفان نوجوان تھا۔ اس نے نوجوانی ہی میں زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔ اس نے نوجوانی ہی میں اپنی محبوبہ اپنی شریکِ حیات رعنا کو کھودیا تھا۔ قدرت کا یہ عجیب مذاق اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اس حادثے کے بعد ٹوٹ سا گیا تھا۔

عرفان اپنے آبائی قبرستان سے نکل کر سڑک پر بے ارادہ چلنے لگا۔ جب وہ گھر پہنچا تو رات بہت ہوچکی تھی۔ عرفان کا آبائی قبرستان الاوہ ء بی بی کے پاس تھا جہاں سے تاریخی بی بی کا علم نکلتا ہے۔

جس کمپنی میں عرفان کام کرتا تھا وہ کمپنی سرکاری دفاتر کو مختلف قسم کے فرنیچر اور برقی سامان مہیا کرتی تھی۔ عرفان کے ذمے ان دفاتر کو سامان فراہم کرنا اور وہاں سے کمپنی کے لیے چیک وصول کرنا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مختلف سرکاری دفاتر سے ہوتا اپنے دفتر کو جاتا تھا۔

عرفان کی زندگی کا یہ معمول بن گیا تھا کہ ہرِ شام وہ اپنے آبائی قبرستان جاتا رعنا کی قبر پر سرخ گلاب بکھیرتا اس کو ایسا کرنے سے رعنا کے قرب کا احساس ہوتا۔ ایک تسکین ملتی۔

وقت رواں دواں تھا۔ عرفان تنہا ہوگیا تھا۔ تنہائی اس کا مقدر بن گئی تھی۔ ایک شام جب آسمان صاف تھا اس پر ایک مدھم سا دل کش ہلال دکھائی دے رہا تھا۔ عرفان اس کی دل کشی میں کھویا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ آج سے چودہ سو برس پہلے اس ماہ کے ہلال کے نمودار ہونے پر عرب قوم کے لوگ سالِ نو کی خوشیاں مناتے تھے لیکن سانحہ ء کربلا کے بعد یہی ہلال علامتِ غم بن گیا۔ ابھی عرفان قبرستان کے قریب الاوہ ء بی بی سے

ہلالِ نو کا نظارہ کر رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ تماشائے غم تو توہینِ غم ہے۔ ضبطِ غم عظمتِ غم ہے۔ غم تو آنکھوں آنکھوں میں پیا ہوا وہ آنسو ہے جو نوکِ مژگاں پر بھی نہ آئے اور دامنِ ضبط میں جذب ہوجائے وہ ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ ایک پُر درد دل سوز نسوانی آواز سنائی دی وہ اس آواز پر ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"وہ پھول زیبا و غنچہ رعنا، وہ سرو بالا، وہ گل، وہ لالہ
عجب چمن تھا کہ یاد اس کی جہاں کو اب تک رلا رہی ہے"

عرفان کے آنسو دامنِ ضبط میں جذب ہوگئے اور وہ پرسوز آواز اس کے وجود میں اتر گئی۔ آواز جو شخصیت کی پہچان ہے۔ وہ بہت دیر تک اس پُر درد آواز میں کھویا رہا۔

انسان کی زندگی پر جب تنہائی اور مایوسی کے گھنے بادل چھا جاتے ہیں اور دور دور تک وہ تنہا ہی اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہے تو کانوں میں گونجتی آواز اس کی رفیق بن جاتی ہے اور کچھ دیر کے لیے وہ اپنی تنہائی بھول جاتا ہے۔ آواز کی شناسائی میں گم ہوجاتا ہے۔ آج عرفان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ آج عرفان کے ہاتھ اس سفید مزار پر سرخ گلاب بکھیر نہ سکے۔

عرفان ہر شام قبرستان جاتے جاتے اولاہ ۔ بی بی کے پاس کچھ دیر کے لیے رک جاتا کہ وہ آواز اسے پھر سنائی دے۔ انسان کی قوتِ ارادی کبھی اس کو منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ عرفان کو بھی جس شخصیت سے ملنے کی خواہش تھی ایک دن اتفاق سے اس کے قریب پہنچ گیا جس دفتر کی

سکریٹری مسز جیولی سے اپنی کمپنی کے کام کے سلسلے میں وہ ملنے گیا تھا اسی دفتر کی اکونٹ آفیسر مس شبانہ تھی ۔ مسز جیولی نے عرفان کا تعارف شبانہ سے کرواتے ہوئے کہا ۔ " آپ اپنی کمپنی کا چک ہماری اکونٹ آفیسر سے لے لیں ۔" شبانہ باذوق تھی ۔ ذہین تھی ۔ اس کا کیبن صاف ستھرا تھا ۔ میز پر سرخ گلاب کے گل دستے سے آراستہ تھا جو اس کی سلیقہ مندی کی غمازی کر رہا تھا ۔ عرفان نے پھولوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ۔۔

" وہ پھول زیبا ، وہ غنچہ رعنا ، وہ سرو بالا ، وہ گل ، وہ لالہ "

اس پر شبانہ چونک پڑی اور پوچھا " عرفان صاحب کیا آپ شاعر ہیں ؟ "

" جی نہیں " عرفان نے کہا ۔

" کیا آپ شاعری سے دل چسپی رکھتے ہیں "

" عرفان نے کہا " جی ہاں "

" یہ شعر آپ نے کہاں پڑھا ؟ "

عرفان مسکرایا اور کہا ۔ یہ شعر میرے ذہن پر نقش ہوگیا ہے ۔ ایک اداس شام جب آسمان پر ہلالِ غم نمودار تھا اور میں الاوہ ء بی بی کے پاس کھڑا اس کی اداسی کا نظارہ کر رہا تھا تو ایک بڑی پُر درد آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے وجود میں اتر گئی اور ذہن پر اس شعر کا

دوسرا مصرعہ

" عجب چمن تھا کہ یاد اس کی جہاں کو اب تک رلا رہی ہے "

چھا گیا ۔ عرفان ذرا جذباتی ہوگیا تھا ۔ شبانہ نے کہا " میں بھی الاوہ ء بی بی کے پاس رہتی ہوں ۔" شبانہ کی آواز جو بہت دیر سے اسے مانوس لگ

رہی تھی وہ راز اب اس پر کھل گیا تھا ۔ عرفان کے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ۔ پھر کمپنی کے چک کی وصولی کا سلسلہ جاری رہا ۔ شبانہ اور مسز جیولی سے عرفان کی ملاقاتیں بڑھتی رہیں ۔

وہ ۲۴ / دسمبر کی ایک رات تھی ۔ گرجے کے گھنٹے سیوع مسیح کی پیدائش کا اعلان کر رہے تھے ۔ عیسائیوں کے دل فرطِ مسرت سے دھڑک رہے تھے ۔ بوڑھے ، جوان ، بچے سب اپنے اپنے نئے لباس میں ملبوس گرجا گھر میں محوِ عبادت تھے ۔ صبح ہوئی تو شہر میں ایک جشن کا منظر تھا ۔ کرسمس کا دن تھا ۔ مسز جیولی کے گھر میں بڑی دھوم دھام تھی ۔ لوگ کرسمس کی مبارک باد دینے چلے آرہے تھے ۔ عرفان نے سوچا کہ آج شبانہ ضرور یہاں آئے گی اور اس سے رسمی ملاقات سے ہٹ کر آج جذباتی ملاقات ہوجائے گی اور وہ اپنے دل کی بات اس سے کہہ دے گا ۔ دن مقدس ہے ۔ محبت مقدس ہے ۔

چھٹی کا دن تھا عرفان مسز جیولی کے گھر پہنچا ۔ توقع کے مطابق شبانہ وہاں موجود تھی ۔ عرفان نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے مسز جیولی کی طرف بڑھاتے ہوئے HAPPY CHRISTMAS کہا ۔ مسز جیولی نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا پھر عرفان نے اپنا ہاتھ شبانہ کی طرف بڑھایا ۔ شبانہ مجبور ہوگئی ۔ اس کا سرد ہاتھ عرفان کے گرم ہاتھ میں تھا ۔ اس کے ہاتھ کی حرارت نے شبانہ کے جسم میں بجلی سی دوڑا دی ۔ حرارت جو زندگی کی علامت ہے ۔ مسز جیولی نے کرسمس کیک پیش کیا عرفان اور شبانہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے باتیں کرتے رہے ۔ کیک کھاتے رہے ۔ عرفان

نے کہا ۔ " ہم پیغمبروں کی پیدائش کا جشن تو مناتے ہیں لیکن ان کے پیغام کو کہاں روبہ عمل لاتے ہیں ۔ ہم سب لوگ بہت سطحی ہوچکے ہیں ۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں عرفان صاحب " لوگ مقصد سے ہٹ گئے ہیں ۔ سطحی باتوں میں الجھ گئے ہیں ۔" شبانہ نے کہا ۔

" ویسے تو ہر پیغمبر ، مفکر ، دانش ور اور بڑا شاعر بھائی چارگی کا تصور پیش کرتا ہے لیکن ہم لوگ خانوں میں بٹ گئے ہیں ۔" عرفان نے کہا ۔ گفتگو طویل ہورہی تھی ۔ لوگ آ جا رہے تھے ۔ شبانہ نے عرفان کو اپنا ہم خیال پایا ۔ عرفان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دل کی بات زبان پر لائی ۔ شبانہ کچھ جھینپ سی گئی ۔ وہ مسکرانے لگی ۔

اب روز ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں ۔ چھے دن پر لگا کر اڑ گئے ۔

۳۱ / دسمبر کی رات آن پہنچی ۔ دنیا کا گوشہ گوشہ نئے سال کا جشن منانے میں مصروف ہوگیا ۔ سارا شہر برقی قمقموں سے جگمگا اٹھا ۔ مسز جیولی کا دیوان خانہ مہمانوں سے بھرا تھا ۔ میوزک سسٹم پر انگریزی دھنیں بج رہی تھیں ۔ سارے جوڑے باہوں میں باہیں ڈالے رقص کر رہے تھے ۔ گھڑی کے گھنٹوں نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا سارے چراغ لمحہ بھر کے لیے گل ہوئے پھر روشن ہوگئے ۔ کمرے میں HAPPY NEW YEAR کے نعرے گونجنے لگے ۔ نئے سال کا رقص شروع ہوگیا ۔ مسز جیولی نے عرفان کو HAPPY NEW YEAR کہتے ہوئے جام بڑھایا ۔ عرفان نے بھی مسز جیولی کو HAPPY NEW YEAR کہا ۔ پھر جام سے جام ٹکراتے ۔ عرفان کی نظریں شبانہ کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ ایک کونے

میں خاموش بیٹھی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ عرفان نے شبانہ کو نئے سال کی مبارک باد دیتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عرفان نے پاس کے گلدستے سے ایک سرخ گلاب نکالا اور شبانہ کی سلجھی ہوئی زلفوں میں لگا دیا۔ شبانہ کی نظریں فرطِ مسرت سے جھک گئیں۔ عرفان شبانہ کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ آج وہ زندگی کے دھارے میں مل گیا ہے۔ حیات کے رقص میں شریک ہوگیا ہے۔۔۔

شہر کی مسجدوں سے اذاں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔

○●○

"اور چراغ جلتے رہے"

سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی یہاں کے چراغ جگمگا اٹھتے تھے اور دن تمام کی یہ سنسان جگہ شام کو آباد ہوجاتی تھی حالاں کہ یہاں کہ بعض آنے والوں کے گھروں میں چراغ جلنا بھی مشکل تھا، کیوں کہ ان کے گھروں میں مٹی کے تیل کے دیئے جلتے تھے۔ ان کو شام کی مدہوشی انھیں رات کو بے سدھ سلا دیتی تھی اور یہ لوگ اندھیرے ہی میں سوجاتے تھے لیکن اس جگہ چراغ برابر جلتے رہتے تھے۔ چراغ جو روشنی کے مینار رہیں۔ چراغ جو بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ چراغ جو منزل کا پتا دیتے ہیں۔ یہ جگہ جہاں چراغ جل رہے تھے، شہر سے دور تھی۔ یہ شہر کا ایک مضافاتی علاقہ تھا اور یہاں جو تاڑی کا کمپاؤنڈ تھا لوگ اسے چندو لعل کا کمپاؤنڈ کہتے تھے۔ یہاں آنے والے یا تو پاس کے کھیتوں میں مزدوری کرتے تھے یا سارا دن اناج کے بورے اٹھا کر بیل گاڑیوں پر لادتے تھے یا پھر وہ رکشا چلانے والے جو یہاں سے ان

بوروں کو شہر پہنچاتے تھے۔ ان لوگوں کی دن بھر کی تھکن دور کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ کمپاؤنڈ ایک وسیع میدان پر محیط تھا اور یہاں سبھی ذات، سبھی مذاہب کے لوگ آتے تھے۔ یہ کمپاؤنڈ ذات پات اور مذہبی جھگڑوں سے پاک تھا۔ اس کمپاؤنڈ میں آنے والے آپس میں معمولی باتوں پر جھگڑ بھی لیتے تو جھگڑے کے بعد جو دوستی ہوتی وہ اتنی مستحکم رہتی کہ ایک دوسرے پر مر مٹنے کے لیے تیار رہتے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہاں جھگڑنے والے ایک دوسرے پر چاقو بھی چلاتے تھے۔

اس وسیع کمپاؤنڈ کی صفائی کے لیے کئی نوکر متعین تھے جو چراغ جلنے سے لے کر رات دیر گئے تک جو بھی کچرا جمع ہوتا اسے وقتاً فوقتاً صاف کرتے تھے۔ کمپاؤنڈ کے مالک کو یہ گوارا نہیں تھا کہ یہ کمپاؤنڈ گندہ رہے۔ یہاں کچرا زیادہ تر ابلے انڈوں کے چھلکے، چاکنے کی جھوٹی پترولیاں اور ردی کاغذ کے ٹکڑے ہوتے تھے۔ اس کمپاؤنڈ میں ہر عمر کے لوگ کام کرتے تھے۔ دس گیارہ برس کے لڑکے لڑکیوں سے لے کر ادھیڑ عمر کے لوگوں تک۔ یہاں کے کام کرنے والوں میں بہت زیادہ بھائی چارگی تھی۔ یہ لوگ مست اور مگن رہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہاں کی کھلی فضا میں مہکتی تاڑی کی بو تھی۔

یہاں کے کام کرنے والوں میں وہ لڑکا لڑکی تھے جن کی عمر دس اور گیارہ سال کی تھی۔ لڑکے کو لوگ منسا کے نام سے پکارتے تھے اور لڑکی کو چمپا یہ دونوں بھائی بہن تھے۔ منسا یہاں بیٹھ کر تاڑی پینے والوں کو

تاڑی لاکر دیتا اور چمپا کمپاؤنڈ میں جھاڑو لگاتی ۔ ان دونوں کو اپنی اجرت سے کچھ زیادہ ہی مل جاتا تھا ۔ منسا کو تاڑی پینے والے کچھ پیسے اپنی طرف سے دے دیتے اور چمپا کو چاکنا بیچنے والے سے لےکر ابلے انڈے اور چنے والے تک کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تاکہ چمپا ان کے خوانچوں کے اطراف جھاڑو لگاتی رہے ۔ دونوں بھائی بہن خوش خوش اپنے آپ میں مگن رہتے چمپا جب کام سے تھک جاتی تو پاس ہی اپنی جھونپڑی میں جاکر سو جاتی ۔ اسے تنہائی کا کوئی خوف نہ تھا ۔ منسا چھوٹا ہونے کے باوجود اپنی بہن کا پورا پورا خیال رکھتا تھا ۔ یہ دونوں پیسے کی لالچ سے بہت دور تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی زندگی اطمینان و سکون سے بسر ہورہی تھی اور ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی ۔

رفتہ رفتہ چمپا اپنا لڑکپن چھوڑ کر سنِ بلوغت کی طرف آرہی تھی ۔ اس کے بدن کے خطوط نمایاں طور پر نظر آنے لگے تھے ۔ اس کی چولی اس کے سینے کے ابھار کی تاب نہ لاکر تنگ پڑتی جارہی تھی ۔ اب وہ چولی لہنگا چھوڑ کر ساڑی بلاؤز پہننے لگی تھی ۔ اس کی کمر میں لچک اور چال میں مٹک آتی جارہی تھی ۔ جب وہ جھاڑو لگانے کے لیے جھکتی تو اس کی ساڑی کا پلو گر جاتا اور تاڑی پینے والوں کی نظریں اس کے سینے پر جم جاتیں ۔ شرفو میاں تو اپنی نظریں اس پر گاڑ دیتے ۔

شرفو میاں تھوڑے بہت پڑھے لکھے تھے ۔ وہ بلا ناغہ اردو اخبار پڑھتے تھے وہ ایک ہوشیار آدمی تھے اور اسی کمپاؤنڈ کے پاس ان کے پان سگریٹ کا ڈبا تھا وہ پان بہت اچھا بناتے تھے ۔ نہ جانے وہ پان میں کیا

ڈالتے تھے کہ دور دور سے لوگ ان کی دوکان پر پان کھانے آتے اور ایک مرتبہ ان کی دوکان کا پان کھانے والا دوسری مرتبہ یہاں ضرور آتا اور کمپاؤنڈ کے تو بہت سارے لوگوں کو ان کے پان کا چسکہ لگ گیا تھا ۔ تاڑی پینے کے بعد شرفو میاں کا پان کھانا ان لوگوں کے لیے ضروری تھا ، اس طرح شرفو میاں کی آمدنی کافی ہوگئی تھی وہ بھی کمپاؤنڈ کے مستقل گاہک بن گئے تھے اور چمپا کو اپنانے کی خواہش رکھتے تھے گو کہ شرفومیاں شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے ۔ رامو کا شرفو میاں سے دوستی کا سلسلہ یوں چل پڑا کہ رامو ان کی دوکان پر روز پان کھاتا اور سگریٹ خریدتا بلکہ کبھی کبھی ادھار بھی لے لیتا تھا صرف اتنا ہی نہیں رامو ان سے روز تازہ خبریں سنتا اور شرفومیاں روز اسے اخبار پڑھ کر سناتے تھے ۔

رامو نوجوان تھا وہ سیکل رکشا چلاتا اور روز یہاں سے اناج کے بورے لے کر شہر جانے سے پہلے کمپاؤنڈ ضرور آتا ۔ شرفومیاں چراغ جلنے سے پہلے ہی اپنی دوکان بند کردیتے کیوں کہ ان کی دوکان پر چراغ کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ رامو بھی اندھیرا ہونے سے پہلے ہی کمپاؤنڈ آتا اور دونوں ساتھ بیٹھ کر تاڑی پیتے اور ابلے چنے کھاتے ۔ شرفو میاں اس لیے بھی بڑے شوق سے خوانچے والے سے چنے منگوا کر کھاتے اور رامو کو کھلاتے کہ جس کاغذ کی پڑیا میں چنے بندھے ہوتے اس پر بعض وقت کسی شاعر کا کلام چھپا ہوتا اور جب ایسا کوئی کاغذ ان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ جھوم جھوم کر رامو کو اشعار سناتے ، اس کو ان اشعار کا مطلب سمجھاتے اس پر اپنی برتری کی

دھاک جماتے ۔ اس وقت دونوں کے تصور میں چمپا رہتی ۔ دونوں کی نظریں چمپا پر رہتیں ۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا ۔ رامو بھی شرفو میاں کی طرح چمپا کو اپنانا چاہتا تھا ۔

یہ معمول بن گیا تھا کہ دونوں روز ایک ایک لٹّی تاڑی پیتے اور پھر رامو اناج کے بورے اپنی رکشا میں ڈال کر ادھر نکلتا اور شرفومیاں ادھر اپنے گھر کا رخ کرتے جو کمپاؤنڈ سے قریب ہی تھا ۔ وہ گھر پہنچتے تو ان کی جیب تقریباً خالی ہوتی اس پر ان کی بیوی برس پڑتیں لیکن شرفومیاں بڑے چالاک آدمی تھے ۔ وہ چپ ہوجاتے ۔ ان کی بیوی نے سن رکھا تھا کہ مرد پی کر گھر کو نہیں لوٹتے اور رات رات بھر غائب رہتے ہیں لیکن چوں کہ شرفومیاں رات دیر گئے تک گھر سے باہر نہیں رہتے تھے ۔ بلکہ چراغ سلگتے ہی گھر چلے آتے تھے اس لیے ان کی بیوی چپ ہوجاتیں اور بات زیادہ نہیں بڑھتی ۔

شہر کی سرحدیں بڑھتی جارہی تھیں ۔ سڑکیں کشادہ کی جارہی تھیں حکومت نے شرفومیاں کو معاوضہ دے کر ان کی دوکان وہاں سے ہٹادی اور پھر اب سیکل کی جگہ اسکوٹر نے لے لی ، سیکل رکشاؤں کی جگہ آٹو رکشا اور کمپاؤنڈ میں گھڑوں کی جگہ شیشوں نے لے لی ۔ تاڑی کی قیمت میں بھی کافی اضافہ ہوچلا تھا ۔ شرفومیاں کا کمپاؤنڈ آنا بہت کم ہوگیا تھا ۔ لیکن وہ جب بھی کمپاؤنڈ آتے چمپا کو ضرور تکتے بیٹھتے ۔

ایک شام شرفومیاں اور رامو دونوں کمپاؤنڈ میں ساتھ بیٹھے تاڑی پی رہے تھے ۔ دونوں جب زیادہ پی گئے تو شرفومیاں اپنے آپ میں

بڑبڑانے لگے اور جب چمپا ادھر سے گزری تو وہ اس کے حسن کی تعریف کرنے لگے اس پر رامو کو بہت غصّہ آیا اور ان دونوں میں ہاتھا پائی ہوگئی۔ اس دن سے شرفومیاں نے کمپاؤنڈ آنا بالکل چھوڑ دیا۔

دن گزرتے گئے۔ شرفومیاں بےروز گار ہوگئے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں بھی جواب دینے لگے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے اسی پریشانی میں ان کی داڑھی بڑھ گئی تھی اور زلفیں کاندھوں کو چھونے لگی تھیں۔ ایک دن آئینہ دیکھا تو اچانک ان کی چالاکی نے مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کی راہ سجھائی۔ وہ لمبا کرتا پہن کر، سر پر شملہ باندھ کر فرش بچھا کر بیٹھ گئے۔ اب وہ شرفومیاں سے مولوی شرف الدین صاحب بن گئے تھے۔ اردو زبان تو جانتے ہی تھے کچھ عربی آیات اور دعائیں سیکھ لیں اور لوگوں پر پڑھ کر پھونکنے لگے۔ آس پاس کے لوگ آنے لگے۔ لوگوں کا اجتماع بڑھا تو مولوی شرف الدین صاحب نے گھر کی آہک پاشی کروائی اور تعویذ کے حاجت مندوں کے لیے سامنے کے کمرے کی داغ دوزی بھی کروائی اور کمرے میں بیٹھ گئے۔ یہ سب کرنے پر بھی چمپا ان کے ذہن سے نہ نکل سکی۔

ادھر رامو نے بینک سے قرضہ لے کر آٹو رکشا خرید لیا اور کمپاؤنڈ آتا رہا چمپا سے ملتا رہا۔ رامو کی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ چمپا نے کمپاؤنڈ میں جھاڑو لگانے کا کام چھوڑ دیا تھا وہ ہر شام رامو کے ساتھ بیٹھ کر تاڑی پینے لگی تھی کیوں کہ وہ دونوں بہت جلد شادی کرنے والے تھے۔

ایک شام جب مولوی شرف الدین صاحب اپنے حجرے سے نکل

کر باہر ٹہل رہے تھے تو ان کو بہت دور سے باجے کی آواز سنائی دی۔
ان کو بے اختیار چمپا یاد آگئی ادھر چمپا دلہن بنی اپنی ہم جولیوں کے ساتھ
کمیونیٹی ہال میں بیٹھی تھی۔ کمیونیٹی ہال کے سارے چراغ جل رہے تھے
اور چراغ جلتے رہے۔

○●○

"برگد کے پتے"

سورج ابھی غروب کہاں ہوا تھا ۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ بارش مسلسل ہورہی تھی جنگل میں ہوا کہ جھکڑ درختوں کو زمین سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہورہے تھے ۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک اپنی پوری شدت پر تھی وہ ایک طوفانی شام تھی ۔ ہوا کہ سائیں سائیں اور بادل کے گرجنے کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا ۔ وقفے وقفے سے کتّے کے بھونکنے کی وحشت ناک آواز ماحول کو اور ڈراونا بنا رہی تھی ۔ اس جگہ صرف دوچار جھونپڑیاں تھیں اور ان ہی جھونپڑیوں میں ایک جھونپڑی رامی کی تھی اور یہ کتّا بھی اسی کا تھا ۔ لیکن آج یہ کیوں بھونک رہا ہے رامی کو ایک خوف سا محسوس ہوا اور اس ڈراونے اندھیرے نے رامی کے ذہن میں کئی ایک وسوسے پیدا کیے ۔ اس نے جلدی سے اپنی جھونپڑی کا دیا جلایا ۔ ہوا کے تند و تیز جھونکے دیئے کو بجھانے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے اور رامی اپنے آنچل سے دیئے

کی جھلملاتی لَو کو بچانے کی برابر جدوجہد کررہی تھی ۔ روشنی اور زندگی کا یہ عجیب امتزاج تھا ۔ بھگوان اب کیا ہوگا راجو ابھی تک نہیں آیا ۔ رامی نے سوچا ۔

رامی کی جھونپڑی کے کچھ فاصلے پر ایک جنگل تھا اسی جنگل میں صدیوں پرانا برگد کا ایک درخت جس کی پاربیاں بہت دراز تھیں ۔ آج کی طوفانی ہوا نے کئی درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا لیکن صدیوں پرانا برگد کا یہ پیڑ جوں کا توں کھڑا تھا ۔ وقت اس کی حفاظت کر رہا تھا اور وہ وقت کو اپنے آپ میں جذب کیے تنہا کھڑا تھا ۔ نہ جانے کتنے حادثات اور واقعات اس سے وابستہ تھے اور نہ جانے وہ خود کتنے حادثات اور واقعات سے دوچار ہوا تھا ۔ وہ ان واقعات اور حادثات کو سنا سکتا اگر اسے قوتِ گویائی مل جاتی ۔

ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے والوں نے اس پیڑ کے قریب ایک پگ ڈنڈی سی بنادی تھی ۔ جب پیڑ کے قریب سے گزرنے والے راہ رَو دھوپ کی تمازت برداشت نہ کرپاتے تو اس کے سایے میں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ٹھہر جاتے اور پھر شام ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جاتے کیوں کہ شام ہوتے ہوتے اس پر پیڑ کا سایہ ڈراونی دکھائی دینے لگتا ۔

برگد کے اس پیڑ کے بارے میں یہاں رہنے والوں کے متضاد خیالات تھے ۔ کوئی اس کی گھنی چھاؤں سے فائدہ اٹھا کر اس سے الفت کرتا اس کا احترام کرتا اور کوئی اس کی طول طویل قامت اور اس

کی مہیب پارنبیوں سے گھبرا کر منحوس سمجھتا ۔ لیکن وہ اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا ۔ اس میں کوئی تغیّر تھا نہ تضاد ، تضاد تو انسان میں ہوتا ہے ۔ اس کے خیالات میں ہوتا ہے ۔ کوئی برگد کے اس پیڑ کو مہان سمجھتا تھا اور کوئی منحوس ۔ اس کی وجہ شاید وہ من گھڑت کہانیاں تھیں جو اس سے منسوب کردی گئی تھیں ۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہتے ہیں کہ ایک دن ایک آدمی اس پیڑ کے بہت قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک ناگ سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ وہیں مر گیا ۔ پھر اس کی لاش کا بھی پتا نہ چلا ۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ لاش کو جنگلی جانور نے کھا لیا ۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ وہ پرُ اسرار طریقے سے غائب ہوگئی ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں لاش کو اس پیڑ نے نگل لیا ۔

ایک دن یوں ہوا کہ ایک مسافر دھوپ کی تمازت کی تاب نہ لاتے ہوے اس پیڑ کے قریب گرگیا اور بےہوش ہوگیا ۔ پھر جب اس کو اس پیڑ کی گھنی چھاؤں ملی تو اس کی جان میں جان آئی تو وہ پھر سے تازہ دم ہوکر اٹھا اور جاتے جاتے برگد کے پیڑ کو پرنام کیا تو اس دن سے یہ بات مشہور ہوگئی کہ برگد کے پیڑ نے اس آدمی کو ایک نئی زندگی بخشی ۔ اس دن سے لوگ جب بھی اس برگد کے قریب سے گزرتے تو اسے پرنام کرتے ۔

وقت کا دریا دھیرے دھیرے بہتا چلا گیا ۔ آدمی جنگلی جانوروں پر فتح پاتا گیا ۔ وہ نئے نئے ہتھیاروں سے لیس ہوتا گیا اب کوئی موزی

جانور اس کی جان نہیں لے سکتا تھا ۔ وہ جنگلوں میں بے خوف و خطر گھومنے لگا ۔ جانوروں کا شکار کرنے لگا ۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کسی شکاری کو برگد کے اس پیڑ کے قریب شکار کرنے کا موقع نہیں ملا تھا ۔ یا تو اسے یہاں کوئی جانور دکھائی نہیں دیتا یا دکھائی بھی دیتا تو شکاری کی زد میں نہ آتا اس طرح یہ بات دور دور تک پھیل گئی تھی کہ برگد کا یہ پیڑ سب کی حفاظت کرتا ہے ۔ یہ سن کر ایک امیر اور منچلا نوجوان ایک دن اپنے چند دوستوں کے ہم راہ اس جنگل میں شکار کی غرض سے آیا اور برگد کے اس پیڑ کے کچھ فاصلے پر اپنا ڈیرا ڈال دیا اور کسی جانور کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا ۔ جب دو دن گزر گئے اور کوئی جانور وہاں نظر نہ آیا تو وہ تنہا شکار کی تلاش میں دور تک نکل گیا ۔ شام ہونے کو آئی تو اس کے دوستوں کو تشویش ہونے لگی وہ بھی اب برگد کے اس پیڑ اور اس کی دراز پاربیوں سے خوف زدہ ہونے لگے ان کا ساتھی نوجوان واپس نہ آیا تو وہ وہاں سے چلے گئے پھر کچھ دنوں بعد وہ یہاں آئے اور اپنے ساتھی نوجوان کی یاد میں اس جگہ ایک چوکھنڈی کھڑی کردی ۔

پھر یوں ہوا کہ کچھ عرصہ بعد یہاں کے جنگل کاٹے جانے لگے گاؤں آباد ہونے لگا لیکن برگد کا یہ پیڑ اپنی جگہ قائم رہا کوئی اس کو کاٹنے کی ہمت نہ کرتا بلکہ اس کے اطراف ایک چبوترہ تعمیر کردیا گیا اور گاؤں کے لوگ اس کی چھاؤں میں بیٹھنے لگے کیوں کہ یہ سب سے زیادہ سایہ دار تھا ۔ ایک دن کسی نے اس پیڑ پر کُم کُم کا ایک تلک لگا دیا

کیوں کہ یہ پناہ دینے والا تھا ۔ یہ قدیم تھا یہ مہان تھا ۔ اب گاؤں والے اس کے آگے جھکنے لگے اس کو پرنام بھی کرنے لگے ۔

رفتہ رفتہ یہاں کی چوکھنڈی کی جگہ ایک جاگیر دار کی حویلی بن گئی اور جاگیر دار ان گاؤں والوں کا سردار ۔ راجو بھی اب جاگیردار کا خادم تھا اور اس حویلی کے بہت سارے کام کرتا تھا ۔ وہ صبح اٹھتے ہی گاؤں کی باولی پر جاتا ، اشنان کرتا ، برگد کے پیڑ کو کُم کُم کا تلک لگاتا پھر اسے پرنام کرتا ۔

زمانے نے کروٹ بدلی ۔ جاگیر داری نظام نے دم توڑا ۔ ایک نئے نظام نے جنم لیا ۔ جاگیردار کی حویلی ایک سیاسی پارٹی کے دفتر میں تبدیل ہوگئی ۔ راجو نے دیکھا برگد کے پیڑ کے نیچے ایک سیاہ پتھر کھڑا کردیا گیا ہے اور اس پر کُم کُم کا تلک لگا ہے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرخ تلک کے نشان پیڑ سے ہٹ کر کالے پتھر پر نظر آنے لگا ، گاؤں والوں نے پتھر کو مہان مان لیا ۔ ان کا وشواس ایک عظیم و قدیم برگد کے پیڑ سے ہٹ کر ایک چھوٹے سے سیاہ پتھر پر منتقل ہوگیا اور وہ اس کی پرستش کر رہے ہیں اس سے اپنی مرادیں مانگ رہے ہیں ۔

راجو اب پارٹی کے دفتر میں ملازم تھا اس کی زندگی میں فرق آیا تو اتنا کہ اب وہ شام کو گھر جاسکتا تھا جہاں رامی اس کا انتظار کرتی رہتی ۔ اسے اب رات دن جاگیر دار کی حویلی میں رہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہاں کام زیادہ کرنا پڑتا تھا ۔ محنت زیادہ تھی اور کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا تھا ۔

آج راجو روز کی طرح سورج غروب ہونے سے پہلے ہی دفتر سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن آج سورج کا کوسوں پتا نہ تھا۔ آسمان پر سیاہ اور گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کی سائیں سائیں اور بادل گرجنے کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ دفتر کی دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک بھی بند ہوگئی تھی۔ دفتر کے ایک کمرے میں میٹنگ زور و شور سے چل رہی تھی۔ ہر کوئی چلاّ رہا تھا۔ ایک گہما گہمی تھی۔ سیاسی لیڈر آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ راجو ان سارے سیاسی جھمیلوں سے بے نیاز گھر جانے کے لیے بےچین ہو رہا تھا۔ یکایک موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اب راجو سے رہا نہ گیا۔ رامی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ راجو بارش میں نکل پڑا۔ بارش زیادہ تیز ہوگئی وہ اور تیز چلنے لگا اور برگد کے پیڑ کے پاس پہنچ گیا۔ ادھر رامی بےچین ہونے لگی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ وہ اپنی جھونپڑی سے نکل پڑی اور حویلی کی سمت دوڑنے لگی۔ اس کا کتاّ بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ رامی دوڑے جارہی تھی۔ راستہ کٹ نہیں رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور رامی کی نظریں راجو کو تلاش کر رہی تھیں۔ ایک بار بجلی چمکی رامی کی نظروں نے برگد کے پیڑ کو دیکھا بجلی پھر چمکی اس کی نظریں پیڑ کے نیچے کھڑے راجو پر پڑیں وہ تیزی سے آگے بڑھی اور چبوترے پر چڑھ گئی ہوا کا ایک زور دار جھونکا آیا۔ وہ اپنا توازن کھو بیٹھی اور چبوترے پر لگے سیاہ پتھر سے ٹھوکر کھاکر گر پڑی اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ بجلی پھر چمکی اور رامی نے اٹھ کر اپنے خون کا تلک

برگد کے پیڑ پر لگا دیا اور آگے بڑھتے ہوئے رامو کی بانھوں میں جھول گئی ۔ یکایک برگد کی پارنبیاں ہلنے لگیں پتوں میں زور و شور سے سرسراہٹ ہوئی ۔ راجو اور رامی نے دیکھا کہ برگد کے پتے ان پر پھولوں کی طرح نچھاور ہو رہے ہیں ۔

○●○

"اتفاق"

سورج ابھرتا رہا ڈوبتا رہا ۔ ہر دن کے بعد رات اور ہر رات کے بعد دن وقت کا دریا بہتا رہا ۔ وہ وجود میں آیا لیکن اپنے اختیار سے نہیں ۔ وہ روتا رہا اور ہنستا بھی رہا ۔ اس میں بھی اس کے ہوش کا کوئی دخل نہیں تھا ۔ اور جب اس نے ہوش سنبھالا وہ حادثاتِ زندگی اور وارداتِ قلبی کا شکار ہوا ۔ اس کی ماں اسے بچپن میں چھوڑ گئی ۔ اس کا باپ اس سے لڑکپن میں جدا ہوگیا ۔ پھر اس کے شعور نے اسے جھنجھوڑا ۔ حیات کے بعد موت ۔ کیا موت کے بعد پھر حیات ؟ وہ اس فلسفہ میں غرق ہوگیا ۔ آواگان REBIRTH ۔ کیا وہ اپنی موت کے بعد پھر جنم لے گا ۔ وہ اپنے اس جنم سے پہلے بھی ضرور کہیں موجود تھا ۔ وہ سوچتا رہا ۔ سر دھنتا رہا ۔ پھر غمِ روزگار کی فکر نے اس کی ساری سوچ ، سارے فلسفے گڈمڈ کر دیئے ۔

اب وہ گریجویٹ ہوچکا تھا اور ریلوے میں ملازمت کرنے کا

خواہاں تھا ۔ وہ ہر وہ کتاب پڑھتا جس کا ریلویز سے تعلق ہوتا ۔ سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی وہ اپنا عزم لیے نکل پڑتا ، ملک کی بے روزگاری پھر اس کی ریلویز میں نوکری کی تمنا دو متضاد باتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں ۔

ایک دن وہ پرانی کتابوں کی دوکان میں ریلویز کے تعلق سے کتابیں تلاش کر رہا تھا اسے ایک لال ڈائری نظر آئی جس پر انڈین ریلویز لکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً وہ ڈائری خریدلی ۔ اس کو کھولا اچانک ایک تصویر اس کے پیروں پر گری ۔ اس نے تصویر اٹھالی اور اسے حیران و پریشان دیکھنے لگا ۔ تصویر بالکل اس کی ہمشکل تھی ۔ وہ چونک پڑا ، وہ سیدھے اپنے گھر آیا اور ڈائری کے ایک ایک ورق کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کرنے لگا ۔ وہ بار بار اس تصویر کو دیکھتا تصویر بالکل اس جیسی تھی اور تصویر پر ربر اسٹامپ کی مہر تھی ۔ لکھا تھا " اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر روپ نگر ریلوے اسٹیشن " وہ بہت پریشان تھا ۔ وہ کس سے پوچھتا ۔ اس کا کوئی نہیں تھا ۔ نہ دوست نہ مونس نہ کوئی غم گسار ۔ وہ تنہا بہ تقدیر تھا ۔ وہ بچوں کو ٹیوشن دے کر اپنا پیٹ پالتا تھا ۔ اب اس کے وقت کا بڑا حصہ ڈائری پڑھنے یا تصویر گھورنے یا گہری سوچ میں مبتلا رہنے میں کٹتا تھا ۔ پھر وہ سوچتا کیا انسان اپنا دوسرا جنم بھی لے سکتا ہے ۔ اس نے پھر ایک بار ڈائری کو پڑھا ۔ اس میں لکھے سارے واقعات اس کے ذہن پر نقش ہوگئے ۔ اب اس کی ریلوے میں ملازمت کی خواہش اس کا نصب العین بن گئی ۔

کسی بھی کام کا انسان جب عزم کر لیتا ہے تو وہ اسے حاصل

ہوہی جاتا ہے ۔ اس نے ریلوے بورڈ کا امتحان دیا اور کامیاب ہوگیا اور پھر یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کا پہلا تقرر روپ نگر ریلوے اسٹیشن پر ہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے ہوا ۔

ایک شام سورج کہر میں دھندلا گیا تھا ۔ شام کی خنکی بڑھ گئی تھی وادی پر نم فضاؤں کا سکوت چھایا ہوا تھا ۔ پہاڑی کی چوٹی پر واقع روپ نگر ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چراغ بجھے بجھے سے لگتے تھے ۔ مال گاڑی کے ڈبے جو صبح ہوتے ہی پتھر سے لاد دیئے جاتے تھے بے حس و حرکت کھڑے تھے ۔ اسٹیشن ماسٹر کے کالے پتھر کے کمرے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔ اس سے متصل چھوٹا سا ویٹنگ روم جو چوبیس گھنٹوں میں ایک بار کھولا جاتا صبح ہی سے کھلا پڑا تھا اور وہ مختصر سی پاسنجر ٹرین جس میں پتھر توڑنے والے مزدوروں اور ریلوے کے ملازم آتے جاتے تھے اور جس کو صبح ۶ بجے پہنچنا تھا ۔ وہ شام کے دھندلکے میں پہنچی تھا وہ اپنا سوٹ کیس لیے ٹرین سے اترا اور سیدھے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں پہنچ گیا ۔ کمرے میں بالکل اس کی ہم شکل تصویر لٹک رہی تھی ۔ وہ چونک پڑا ۔ پھر وہی تصویر ؟

اسٹیشن ماسٹر جو عرصہ دراز سے اسی اسٹیشن پر اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اب بوڑھا ہوچکا تھا اور وہ اس جگہ کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا ہنوز اس کے اسٹنٹ کی جائیداد بھی پُر نہیں ہوئی تھی ۔ جب بھی اس کے تبادلے کے لیے لکھا یا کہا جاتا وہ ٹال جاتا ویسے بھی اس ریلوے اسٹیشن پر کام کرنے کے لیے ریلوے ملازم ٹال مٹول کرتے تھے ۔ کیوں

کہ روپ نگر ریلوے اسٹیشن سے عجیب و غریب کہانیاں وابستہ تھیں ۔ پھر اسٹیشن ماسٹر کی بھی اپنی ایک داستان تھی ۔

جب اسٹیشن ماسٹر نے اس نوجوان کو اپنے کمرے میں دیکھا تو وہ ہکابکا رہ گیا ، پاس کھڑے پوٹر نے اپنی قندیل اٹھا کر نوجوان کے چہرے پر روشنی ڈالی اور پلٹ کر تصویر کو دیکھا اور قندیل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی وہ کانپتا ہوا اسٹیشن کے باہر نکل گیا ۔ اسٹیشن ماسٹر جو عمر رسیدہ اور تجربہ کار تھا نوجوان کو بیٹھنے کے لیے کہا پھر پوچھا ۔

" تم یہاں کیسے اور کس لیے آئے ہو ؟ "

" میں یہاں اسی ٹرین سے آیا ہوں اور اسی اسٹیشن پر میرا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا ہے ۔"

" اسی اسٹیشن پر ! تم پہلے بھی کبھی یہاں آئے تھے ؟ "

" نہیں ۔ ۔ ۔ میں یہاں پہلی بار آیا ہوں ۔"

" عجیب اتفاق ہے ۔" اسٹیشن ماسٹر نے کہا ۔

" ہاں آپ اسے اتفاق ہی سمجھیں اور اگر آپ کو میں یہ بتلادوں کہ اس کمرے میں کونسی چیز کہاں رکھی ہے ۔ تو آپ کیا سمجھیں گے ؟ "

" مذاق کر رہے ہو ۔"

" نہیں میں سنجیدہ ہوں " نوجوان نے کہا " آپ کی الماری کے سیدھے ہاتھ کے دراز میں آپ کی بکنگ کیبنٹ کی چابیاں رکھی ہیں ۔"

اسٹیشن ماسٹر ایک گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ " اف اتنی طویل مدت بعد پھر وہی نوجوان ! کیا انسان اپنا دوسرا جنم بھی لے سکتا ہے ؟ "

" بابو جی میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہتا ہوں ۔" نوجوان نے جیسے اسٹیشن ماسٹر کو گہری سوچ سے چونکا دیا ہو ۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا ۔

" وہ رات بڑی سرد تھی ۔ آپ سردی سے کانپ رہے تھے ۔ آپ بہت مغموم تھے اور اپنی زندگی سے دل برداشتہ ۔ آپ اپنے سارے خاندان والوں سے جھگڑ کر گھر چھوڑ کر نکلے تھے ۔ آپ جس لڑکی سے محبت کرتے تھے اور شادی کرنا چاہتے تھے وہ آپ کے ذات کی نہیں تھی ۔ ہاں بابو جی یہ ذات پات چیز ہی ایسی ہوتی ہے ۔ پھر بھی وہ آپ کو بہت چاہتی تھی ۔ اور ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھی ۔ اس نے آپ سے التجا بھی کی تھی کہ آپ اپنا گھر اپنا شہر نہ چھوڑیں لیکن آپ نے اس کی ایک نہ مانی ۔ آپ میں حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی ۔ پھر آپ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے دور یہاں روپ نگر چلے آئے وہ ہمت نہ ہاری اور آپ کی تلاش میں نکل پڑی " کیا یہ سب میں سچ کہہ رہا ہوں ؟ "

" ہاں " اسٹیشن ماسٹر کے حلق میں آواز گھٹ گئی پھر نوجوان نے کہنا شروع کیا ۔ " وہ صبح بڑی دل فریب تھی ۔ وادی پر سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں پڑ رہی تھیں اور یہی پاسنجر ٹرین ٹھیک وقت پر پہنچی تھی ۔ آپ کی محبوبہ ٹرین سے اتری اور سیدھے آپ کے کیبن میں آگئی ۔"

نوجوان اس سے آگے کچھ کہنے کے لیے سوچ میں پڑ گیا اور اپنے ذہن پر بار ڈالنے لگا وہ لال ڈائری جو اس نے پڑھی تھی اس میں لکھے واقعات اس کے ذہن سے مٹنے لگے پھر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا ۔

رات کی زلفیں دراز ہوچکی تھیں ۔ اسٹیشن پر مکمل تاریکی چھا گئی

تھی ہوا کے سرد جھکڑ چل رہے تھے ۔ کبھی کبھی بہت دور بستی کے چھوٹے سے سینما گھر سے آخری شو کی اختتامی موسیقی سنائی دے رہی تھی ۔ اسٹیشن ماسٹر سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھا تھا ۔ نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا ۔ " وہ دن اس اسٹیشن کا تاریخی دن تھا ۔ مال گاڑی کے ڈبے پتھر سے لدے اسی پلیٹ فارم پر کھڑے تھے ۔ پاسنجر ٹرین کے آنے کا وقت قریب آرہا تھا اور ان ڈبوں کو یہاں سے ہٹانا تھا ۔ اسی ریلوے لائین سے متصل لائین پر انجن جوں کی طرح رینگ رہا تھا ۔ انجن ڈرائیور کا دم گھٹا جارہا تھا لیکن انجن کو کراسنگ پار کراکے پیچھے کی طرف لوٹانا تھا اور ان ڈبوں سے جوڑنا تھا انجن ڈرائیور آہستہ آہستہ انجن کو پیچھے لے آیا ۔

ڈبوں کو دھچکا سا لگا اسی وقت انجن ڈرائیور پر دل کا دورہ پڑا پوٹر نے کھٹاخ سے ڈبوں کو انجن سے جوڑ دیا اور ہری جھنڈی ہلائی لیکن ڈبے جوں کے توں بے حس و حرکت اپنی جگہ سے نہ ہلے انجن رکا رہا پوٹر انجن پر چڑھ گیا ۔ انجن ڈرائیور مرچکا تھا ۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر دوڑتا ہوا انجن تک پہنچ گیا ، کچھ دیر تو وہ سوچتا رہا ۔ پھر اس نے انجن پر چڑھ کر بڑی چابک دستی سے ان ڈبوں کو پلیٹ فارم سے ہٹادیا ایک بڑا حادثہ ٹل گیا ۔"

اس کے آگے لال ڈائری کے اوراق سادہ و پژ مردہ پڑے تھے ۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ بہت دور سے پاسنجر ٹرین کی سیٹی سنائی دے رہی تھی آج یہ پاسنجر ٹرین ٹھیک وقت پر آرہی تھی ۔

○●○

"کرب"

سورج ابھی اندھیرے کو دور نہ کرپایا تھا ۔ ہر طرف اندھیرا اندھیرا سا تھا ۔ آسمان پر ایک ایک ستارہ دم توڑ رہا تھا ۔ سردی کا موسم تھا ۔ فضا میں ایک خاموشی تھی ۔ ایک سنناٹا تھا ۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں محوِ خواب تھے ۔ حاجی بدرالدین صاحب کے گھر والے ابھی نیند سے بیدار نہیں ہوئے تھے لیکن دور سے مسجد کی اذاں کی آواز نے حاجی صاحب کو جگا دیا تھا ۔ حاجی صاحب ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے اور چمڑے کی فیکٹری کے مالک ۔ وہ صبح سویرے اذاں کی آواز پر اٹھ جاتے اور مسجد چلے جاتے نماز کچھ جلدی ختم کرکے گھر چلے آتے ۔ شانو بی کو آواز دیتے وہ اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ جاتی ۔ حاجی صاحب کے لیے گرم گرم پراٹھے ڈال دیتی حاجی صاحب ناشتہ کرتے اور اپنی فیکٹری کے لیے نکل جاتے ۔ یہ ان دونوں کے لیے روز کا معمول تھا ۔ حاجی صاحب کچھ جلد باز قسم کے آدمی واقع ہوئے تھے اور ان کی یہی جلد بازی نے ان کے مزاج

میں جھنجھلاہٹ پیدا کردی تھی ۔

شانو بی کو حاجی صاحب کے گھر میں ملازم ہوئے کوئی چھے سال ہوگئے وقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو اس کا بچہ صرف ایک سال کا تھا ۔ آج جب کہ وہ پراٹھے ڈال رہی تھی اس کے ذہن پر ماضی کے نقوش ابھر آئے اس نے ایک کرب سا محسوس کیا آنکھوں میں آنسو ڈب ڈبائے ۔

شانو بی کا نام شاہانہ تھا ۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئی تھی ۔ اس کے ماں باپ گاؤں کے بس اسٹاپ کے قریب ایک چھوٹاسا چائے خانہ چلاتے تھے ۔ یہ چائے خانہ ان کے ذاتی گھر کا ایک حصہ تھا ۔ شاہانہ کا بچپن اسی گاؤں میں گھومتے پھرتے گزرا تھا ۔ آج اس کو اپنے ماضی کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی ۔ وہ کس طرح آم کے درختوں پر چڑھ جاتی ، وہ کیسے املی کے پیڑ پر پتھر مار مار کر املی گراتی اور اسے چٹخارے لے کر کھاتی دن گزر گئے ۔ وہ جوان ہوگئی اور خوب پھوٹ پھاٹ کر نکلی ۔ جیسے جیسے وہ جوانی کے منازل طے کرتی گئی اس کے ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر بڑھتی گئی ۔ گاؤں میں ان کو شاہانہ کے لیے کوئی مناسب لڑکا نظر نہ آیا پھر جس بس اسٹاپ پر ان کا چائے خانہ تھا وہ بس اسٹاپ وہاں سے ہٹا دیا گیا ان کے کاروبار ٹھپ ہوگئے اور شاہانہ کی جوانی داد طلب اب ان کو گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کے سوا کچھ نہ سوجھا ۔ انھوں نے اپنے چھوٹے سے گھر کو بیچ ڈالا اور شہر کی طرف چل پڑے ۔ شہر کی آبادی بڑھ گئی تھی ۔ یہاں رہنے کے لیے جگہ کا ملنا دشوار تھا ۔

گرانی آسماں کو چھو رہی تھی ۔ بےروزگاری کا بول بالا تھا ۔ ان کے لیے یہاں گزر بسر کرنا مشکل ہوگیا تھا پھر شاہانہ کی جوانی ان کے سینوں پر مونگ دل رہی تھی ۔ یہاں نوجوان لڑکے زیادہ تر بےروز گار تھے ۔ اگر کچھ کام بھی کرتے تو چائے خانوں میں میز صاف کرتے یا پھر جھوٹی پیالیاں اٹھاتے ۔ ان کو بہت معمولی اجرت ملتی ۔ ان کے رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا بھی نہ تھا ۔ شاہانہ کے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ بھی نہ تھا کہ اپنے ہونے والے داماد کو کسی دھندے سے لگا دیتے شاہانہ کے ماں باپ کی پریشانی بڑھتی چلی جارہی تھی ۔

ایک دن شاہانہ کی شادی ایک رکشا چلانے والے نوجوان اسلم سے ہوگئی ۔ اسلم جوان تھا صحت مند تھا اس کی رگوں میں گرم لہو دوڑ رہا تھا اس کے لیے شاہانہ بیوی کم عورت زیادہ تھی اور وہ عورت کو برتنا خوب جانتا تھا ۔ اس نے شاہانہ کی جوانی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بہت جلد شاہانہ حاملہ ہوگئی اور اسلم کے لیے اپنے جسم کی ساری کشش کھو بیٹھی پھر ایک دن اسلم رکشا لے کر غائب ہوگیا ۔ شاہانہ تنہا بہ تقدیر رہ گئی ۔ اس کو پھر اپنے ماں باپ کا سہارا لینا پڑا ۔ کچھ مہینوں بعد اس نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا جس کا نام انھوں نے شیخ چاند رکھا اور یہی بچہ حاجی صاحب کے گھر آنے کے بعد شیخ چاند سے چاند ہوگیا ۔ توّے پر روٹی جل رہی تھی شانو بی نے روٹی کو الٹ دیا ماضی سے حال لوٹ آئی ۔

ایک دن جب چاند کو تیز بخار چڑھا تو حاجی صاحب نے اس کے گلے میں بسم اللہ کی تعویذ ڈالی تھی جس سے اس کا بخار اتر گیا تھا ۔ شانو

بی نے سوچا جب چاند بڑا ہوجائے گا تو حاجی صاحب اس کو اپنی فیکٹری میں نوکری دے دیں گے ۔ اس کا مستقبل سنور جائے گا لیکن حاجی صاحب کو چاند ایک آنکھ نہ بھاتا تھا بلکہ ان کو اس سے ایک نفرت ہوگئی تھی کیوں کہ چاند کا مشغلہ مٹی سے مورتیاں بنانا تھا ۔ چاند کو مٹی سے کھیلنے کا بہت شوق تھا ۔

حاجی صاحب کے گھر سے کچھ فاصلے پر مورتیاں اور گنیش بنانے کا ایک کارخانہ تھا اور چاند کا زیادہ وقت وہیں گزرتا تھا ۔ جو حاجی صاحب کو بالکل پسند نہ تھا ایک دن جب چاند گنیش کی ایک مورتی بناکر گھر لایا تو حاجی صاحب کو بہت غصّہ آیا اور انھوں نے چاند کے گال پر ایک زبردست طمانچہ مارا ۔ چاند چکرا گیا وہ گر پڑا پھر گھر سے بھاگ نکلا ۔ شانو بی چیختی چلاّتی رہی ۔

شہر کی سڑکیں وسیع تھیں ان پر موٹریں اور بسیں تیزی سے دوڑ رہی تھیں ۔ ہر کوئی اپنی منزل کی طرف دوڑا جارہا تھا اور ان ہی سڑکوں پر چاند مارا مارا پھر رہا تھا ۔ اس کی کوئی منزل تھی نہ ٹھکانہ ۔ وہ بھوکا پیاسا تھا ۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ۔ اس کے دماغ میں حاجی صاحب کا طمانچہ گھوم رہا تھا ۔ وہ جائے تو کہاں جائے کدھر جائے سورج غروب ہونے کو آگیا ۔ شام ہونے لگی فضا میں اندھیرا پھیلنے لگا ۔ سڑک پر برقی قمقمے جگمگانے لگے ۔ چاند بھوک سے نڈھال حاجی صاحب کے گھر کی طرف دوڑنے لگا کہ یکایک کار سے ٹکرا گیا ۔ کویتا نے کار کو پوری طاقت سے بریک لگایا ۔ کار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی لیکن چاند سڑک پر گر پڑا

اور بے ہوش ہوگیا لوگ جمع ہوگئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں کویتا نے چاند کو اپنی کار میں ڈال لیا اور نزدیک کے نرسنگ ہوم میں پہنچ گئی چاند کو گہرے زخم نہیں آئے تھے لیکن وہ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر نے طاقت کے انجکشن لگادیئے۔ چاند کو جب ہوش آیا تو وہ اپنے آپ کو ایک خوب صورت فلیٹ میں پایا۔

کویتا کا فلیٹ بہت ہی خوب صورت تھا۔ جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ ڈرائینگ روم نیم عریاں تصویروں سے سجا بیڈروم، سنگھار میز پر رکھے ہوئے بدیشی پرفیوم سے کمرہ معطر، الماری میں بھی بدیشی ساڑیاں تھیں۔ غرض اس کا فلیٹ بڑا دل نشین تھا۔ خود بھی غضب کی دل کش تھی۔

وہ نرسنگ ہوم سے فلیٹ میں آئی تو رات ہوچکی تھی۔ فلیٹ کے نیچے سیٹھ دھرم داس کی شاندار امپورٹیڈ کار کھڑی ہارن بجا رہی تھی۔ کویتا نیچے اتر آئی اور کار کو واپس کردیا۔ وہ چاند کے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ چاند جو دن بھر کا بھوکا تھا اس کھانے کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ پیٹ بھر کھانا کھایا اور مزید کچھ سوچے وہ وہاں آرام دہ بستر پر پڑگیا۔ نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ کویتا کی آنکھوں سے نیند غائب ہوگئی۔ وہ چاند کے پاس بیٹھی ایک سوچ میں پڑگئی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کی زندگی ادھوری تھی وہ صرف سیٹھ دھرم داس کی رکھیل تھی۔ آج رات جب وہ ایک معصوم لڑکے کے سرہانے بیٹھے اپنے دل میں ایک نامعلوم سی محبت کا جذبہ محسوس کی تو وہ چاند سے لپٹ گئی۔

کویتا کی زندگی کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر رات بن سنور کر سیٹھ

دھرم داس کی امپورٹڈ کار میں اس کے گھر جاتی پھر ساری رات ایک کرب ایک اذیب میں گزر جاتی ۔ صبح ہوتی تو اس کے کپڑے اس کے جسم سے کہیں دور پڑے ہوتے SCOTCH WHISKY کا خالی بوتل سیٹھ دھرم داس کی ہوس ناکی کا مذاق اڑاتا اور کویتا اپنی بےچارگی پر آنسو بہاتی ۔ یہ خوب صورت فلیٹ ، یہ امپورٹڈ کار ، یہ کپڑے ، یہ ٹھاٹ سب کچھ سیٹھ دھرم داس کے دیئے ہوئے تھے کویتا کا کچھ ذاتی نہ تھا اور اگر اس کا کچھ تھا تو اس کا خوب صورت جسم ۔ کویتا چاند کے پاس بیٹھی سوچ رہی تھی کہ عورت ماں ہی کی حیثیت سے عورت پن کی تکمیل کر سکتی ہے ۔

صبح ہوئی تو دونوں کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لائی ۔ اب چاند کویتا کا بیٹا بن گیا تھا اور کویتا نے چاند کی ماں کا روپ دھار لیا تھا " بیٹا تمھارا نام کیا ہے "

" میرا نام چاند ہے " لیکن میں یہاں کیسے آگیا ؟ میری ماں کہاں ہے ؟ " " گھبراؤ نہیں بیٹا " میں تمھاری ماں ہوں ۔"

" میری ماں تو غریب ہے ۔ وہ تو حاجی صاحب کی نوکرانی ہے ۔ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے ہیں ۔ مجھے میری ماں کے پاس لے چلو ۔"

"آج سے میں تمھاری ماں ہوں اور یہ سب تمھارا ہے ۔"

کویتا نے حقیقت میں چاند کو ماں کا پیار ، ماں کی شفقت دی اور پھر وہ چاند سے چندر ہوگیا ۔ کیوں کہ اب وہ کویتا کا بیٹا تھا ۔ اچھے فلیٹ میں رہتا تھا ، اچھے کھانے کھاتا تھا ، اچھے کپڑے پہنتا تھا لیکن وہ اپنی پیدائشی شناخت سے محروم ہوگیا تھا ۔ اس نے اپنے نام کی تبدیلی پر کوئی

احتجاج نہیں کیا۔ شخصی نام کا کیا ہے بس ایک شناخت۔ ایک فرقہ سے تعلق رکھنے والا خورشید کے نام سے پکارا جاتا ہے تو دوسرے سے تعلق رکھنے والے کو سوریا پکارتے ہیں حالاں کہ دونوں نام ایک ہی شئے کے ہیں۔

کچھ دنوں بعد چندر، سیٹھ دھرم داس کے منیجر کو بھی پہچاننے لگا۔ جو کبھی کبھی کویتا کے فلیٹ پر آتا، کویتا اور چندر کی ضروریات پوری کرتا چندر کو ایک بات کھٹکنے لگی کہ وہ رات بھر فلیٹ میں اکیلا رہتا ہے اور کویتا باہر چلی جاتی ہے پھر اس کے بلڈنگ سے نکلنے پر نوجوان لڑکے اس پر جملے کستے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کو یہاں اچھی نظروں دیکھا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی ماں کویتا کو۔

ایک شام جب کہ کویتا اپنا بناؤ سنگھار کر کے سیٹھ دھرم داس کے پاس جانے کے لیے نکل رہی تھی تو چندر اسے ٹوک کر پوچھا۔

" ماں ہر شام تم باہر چلی جاتی ہو اور رات کو بھی واپس نہیں آتیں۔ تم کہاں جاتی ہو ماں۔"

کویتا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کیسے کہتی کہ اس کی رات سیٹھ دھرم داس کے پلنگ کے نذر ہوجاتی ہے۔ وہ یکایک غصّہ میں آگئی اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی اور چندر کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا وہ تڑپ اٹھا اس کو حاجی صاحب کا وہ طمانچہ یاد آگیا۔ اپنی حقیقی ماں کی چیخیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ سڑک پر سیٹھ دھرم داس کی کار کے پہیے تیزی سے گھوم رہے تھے۔ چندر کویتا کے فلیٹ سے نکل کر حاجی صاحب کے گھر کی طرف دوڑ رہا تھا۔ کویتا کار میں گم صم

بیٹھی تھی۔

شہر کا نقشہ بدل رہا تھا سڑکیں کشادہ کی جارہی تھیں ۔ حاجی صاحب کا گھر بھی سڑک کی کشادگی کی زد میں آگیا چاند کی ماں کا کوئی پتا تھا نہ ٹھکانہ البتہ مورتیاں بنانے کا کارخانہ جو حاجی صاحب کے گھر کے قریب تھا ویسے ہی قائم تھا کام کرنے والے کچھ زیادہ ہوگئے تھے ۔ کارخانے میں چہل پہل کافی بڑھ گئی تھی ۔ گنیش اتسو کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں مجسمہ سازوں ، فنکاروں اور مورتیاں بنانے والوں کو جمع کیا جارہا تھا ۔ چندر کے قدم خود بہ خود اس طرف اٹھ گئے ۔ مورتیاں بنانے والے لڑکوں نے چندر کو پہچان لیا چندر کے لیے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا اپنی روزی روٹی کمانے کا اور اپنی صلاحیت بتانے کا ۔ وہ وہاں کام میں جٹ گیا اس کو رہنے کے لیے بھی جگہ مل گئی وہ یہاں پھر چندر سے چندو بن گیا یہاں کے سارے لڑکے اسے چندو پکارتے اس کے نام کی یہ تبدیلی اسے پسند نہ آئی لیکن یہاں اس کے پیٹ کا مسئلہ تھا ۔ کارخانے میں بڑے بڑے دیو پیکر گنیش بنائے جارہے تھے ۔ چندو بھی گنیش کے ایک دیو پیکر مجسمے کے نیچے بنائے جانے والے ایک خوب صورت کنول پر بڑی محنت اور مشقت سے کام کرنے لگا جوں جوں کنول تیار ہوتا جارہا تھا چندو اپنی فنکاری پر خوش ہوتا جارہا تھا ۔ کبھی کبھی جب اس کو اپنی ماں یا کویتا یاد آجاتی تو وہ ایک کرب محسوس کرتا ۔ کنول تیار ہوگیا اب اس پر رنگ چڑھانا باقی تھا ۔ چندو نے کنول کے لیے ایک نہایت خوب صورت رنگ تیار کیا اور اس پر رنگ چڑھانے لگا ایک طرف کنول پر رنگ چڑھایا

جارہا تھا تو دوسری طرف کویتا اپنا رنگ روپ کھو رہی تھی ۔ زندگی کا یہ کتنا بڑا تضاد ہے ۔ فنکاری تو مٹی کو رنگ و روپ دے کر اسے خوب صورت بناتی ہے اور ہوس ناکی خوب صورت عورت کا رنگ و روپ بگاڑ دیتی ہے ۔ جب کویتا کا روپ بگڑ گیا تو سیٹھ دھرم داس نے اس سے نظریں پھیرلیں ۔ کویتا اب تنہا ہوگئی تھی ۔ پیسے اور گاڑی اس سے دور ہوگئے تھے ۔ آہستہ آہستہ اس کی چیزیں اور کپڑے بازار کی نذر ہونے لگے اور ایک دن جب کچھ بھی نہ رہا بکنے کو تو اس کے جسم کی تجارت ہونے لگی ۔ وہ جسم فروشی کے بازار میں آگئی اور بہت جلد اس کا حسن لٹ گیا ۔ اب اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور وہ امراضِ خبیثہ کا شکار ہوگئی ۔

آج گنیش جی کا وسرجن تھا ہر طرف شور و غل برپا تھا ، ہنگامہ تھا ۔ سڑکوں پر لاؤڈ اسپیکر چلا رہے تھے ۔ ہر سمت سے گنیش جی کی چھوٹی بڑی مورتیاں بڑے جلوس میں شامل ہورہی تھیں ۔ لاریوں اور سڑکوں پر بڑے بڑے اور اونچے اونچے گنیش چڑھائے جارہے تھے ۔ ٹرکوں میں گنیش جی کے ساتھ زرد کپڑے پہنے بیٹھے کارسیوک بھجن الاپ رہے تھے ۔ ایک بڑی ٹرک میں گنیش جی کا سب سے بڑا دیو پیکر مجسمہ ایک خوب صورت کنول پر بیٹھا نظر آرہا تھا ۔ اس خوب صورت کنول کو چندو نے بنایا تھا ۔ شہر کی ایک وسیع سڑک پر ایک طویل جلوس کے ساتھ گنیش جی کا یہ مجسمہ آگے بڑھ رہا تھا بھجنوں کا شور تھا چندو بھی جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔ دوپہر کی تیز دھوپ تھی تالاب کے کٹے کی سڑک پر یہ جلوس آگے بڑھ رہا تھا ۔ کٹے کے نیچے کی سڑک پر ساتھ ساتھ چار آدمی

اپنے کندھوں پر ایک ارتھی اٹھائے رام نام ستیہ ہے کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ۔ لیکن یہ نعرہ اس شور و غل میں دب گیا تھا ۔

چندو کی نظریں ارتھی کے ان چار آدمیوں اور اس کے آگے چلتے سیٹھ دھرم داس کے منیجر پر پڑی ۔ چندو کے منھ سے بےساختہ نکلا " سچ ہے رام نام ستیہ ہے ۔" وہ اس طویل جلوس کو چھوڑ کر پانچ آدمیوں کے مختصر سے جلوس میں مل گیا ۔

سیٹھ کے منیجر نے چندر کو پہچان لیا ۔ ارتھی شمشان گھاٹ پہنچ گئی چتا پر لکڑیاں جمادی گئیں ۔ تیل ڈال دیا گیا منیجر نے ایک جلتی لکڑی اس لڑکے کو تھما دی ۔ جس کے گلے میں بسم اللہ کا تعویذ لٹک رہا تھا ۔ چاند نے چتا کو آگ لگادی ۔

○●○

"بچہ بھوکا ہے"

شہر کا یہ بہت ہی قدیم اور وسیع باغِ عامہ ہے، یہاں بے شمار درخت ہیں اور جا بہ جا ہریالی کے سرسبز فرش بچھے ہیں۔ یہاں خوب صورت گلاب کے تختے اور پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ شہر کے بیچوں بیچ یہ مقام بہت دلفریب اور پُر سکون ہے۔ لوگ تفریح اور چہل قدمی کے لیے اکثر یہاں آتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ باغِ عامہ طویل دیوار سے گھرا ہوا ہے اور اس کے دو وسیع گیٹ ہیں جو رات کو بند کردیئے جاتے ہیں۔ اس مقام سے کئی کہانیاں اور لطیفے منسوب ہیں۔

سنا جاتا ہے کہ ایک دن جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی یہاں کے مہتمم نے مالی سے پوچھا "پودوں کو پانی کیوں نہیں دے رہے ہو۔"

مالی جواب دیا "سرکار بارش ہو رہی ہے۔" مہتمم نے حکم دیا "چھتری لے کر پانی دو۔"

باغِ عامہ میں کسی کو رات میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر

بھی کچھ بھکاری چوکیداروں کی نظروں سے بچ کر اندر درختوں میں چھپ جاتے ہیں اور رات کو ہریالی کے فرش پر سردی سے اکڑتے اوس میں بھیگتے سوجاتے ہیں کیوں کہ ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ صبح کو پو پھٹنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ جاتے ہیں اور یہیں سے ان کی روٹی روزی کے کاروبار شروع ہوجاتے ہیں۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ نسیمِ سحر کے جھونکے پھولوں کو چومتے پتوں کو بیدار کرتے ایک سمت سے دوسری سمت گزر رہے تھے اوس کے گرنے سے فضا میں خنکی آگئی تھی۔ جوان شاردا اور شانتی کے ہریالی کے بستر بھیگ گئے تھے۔ شاردا اور شانتی کی زندگی کا آغاز ہر صبح یہیں سے بھیک مانگنے سے شروع ہوتا صبح سویرے کچھ لوگ ہریالی پر چہل قدمی کے لیے آجاتے تو شاردا اور شانتی کو بھیک مل جاتی۔ وہ دونوں بچپن ہی سے بھیک مانگتے مانگتے اس نوجوانی کی عمر کو پہنچ گئے تھے اور پوری طرح پیشہ ور بھکاری بن گئے تھے۔ بھیک مانگنے کے نت نئے طریقے آزماتے۔ ہر روز جب کہ ماحول میں کچھ اندھیرا اندھیراسا رہتا ایک بوڑھی عورت ایک ننھے سے بچے کو لیے باغِ عامہ کی گیٹ پر شاردا اور شانتی کا انتظار کرتی۔ شاردا پہنچتے ہی وہ بوڑھی عورت اس بچے کو شاردا کے حوالے کردیتی اور غائب ہوجاتی۔ شاردا اس ننھے سے بچے کو لیے سامنے والے رستوراں پہنچ جاتی اور غائب ہوجاتی۔ شاردا اس ننھے سے بچے کو لیے سامنے والے رستوراں پہنچ جاتی اس کا مالک شاردا کو ایک بن اور ایک چائے بھیک دی دیتا عان اسی وقت اردو اخبار کا ایک پریس رپورٹر

اخبار دیکھنے اور چائے پینے کے لیے وہاں آجاتا۔ یہ دونوں کے لیے روز کا معمول تھا۔ شاردا کو چائے کے ساتھ بن بھی مل جاتا لیکن اس ننھے بچے کو دودھ کے بجائے صرف چائے سے پیٹ بھرنا پڑتا۔ پریس رپورٹر کو تو صرف چائے ہی پر اکتفا کرنا پڑتا۔

باغِ عامہ کی گیٹ سے لگے بس اسٹاپ پر صبح کی اولین ساعتوں میں فیکٹری جانے والوں کی بھیڑ رہتی بس تو نہیں آتی لیکن شاردا آجاتی اور مسلسل ایک ہی صدا لگاتی "بچہ بھوکا ہے بابا پیسے دے دو ... بچہ بھوکا ہے" اس صدا کے ساتھ ہی بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں کی نگاہیں شاردا کے نیم برہنہ جوان جسم پر پڑتیں وہ اسے گھورنے لگتے۔ بچہ روتا رہتا۔ پھر اس کی جھولی میں کچھ پیسے پڑجاتے۔ لوگ آتے رہتے جاتے رہتے اس طرح صبح سے دوپہر ہوجاتی۔ دوپہر میں شاردا اسی ریستوراں کے سامنے بیٹھ کر باہر والے سے کھانا منگواتی جس کے ساتھ دال فری میں آجاتی۔ وہ چائے منگواتی بچے کو پھر دودھ کے بجائے چائے ملتی اس کے بعد بچہ شانتی کے حوالے ہوجاتا۔ رات ہوتی تو پھر وہی بوڑھی عورت رات کے اندھیرے میں بچہ کو واپس لے لیتی اور کچھ پیسے بٹور لیتی۔

آج اس ریستوراں کے پاس بڑی بھیڑ تھی۔ دفتروں کے بابو لوگ اپنا کام چھوڑ کر باہر نکل آئے تھے۔ سب یہاں جمع ہوگئے تھے اور زور دار نعرے لگا رہے تھے۔ "ہمار مانگیں پوری کرو" لیڈر تقریر کر رہے تھے۔ پولیس کانسٹیبل ہاتھوں میں لاٹھی لیے انھیں اور اکسا رہے تھے۔ پریس رپورٹر ہاتھوں میں کیمرے لیے اور کندھوں پر بیگ لٹکائے تصویریں

کھینچنے کی فکر میں تھے ۔ رستوراں کے اشیائے خوردنی ہاتھوں ہاتھ بک رہی تھیں گو کہ ان کی قیمتیں کافی بڑھا دی گئی تھیں ریستوراں کا مالک موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا ۔ دوپہر کا وقت آگیا تھا ۔ گرمی تیز ہوتی جارہی تھی ۔ بابو لوگوں کے نعرے زیادہ بلند ہورہے تھے ۔ ہر کوئی چیخ رہا تھا " ہماری مانگیں پوری کرو " ان آوازوں میں پھر ایک بار صدا ابھری ۔ " بچہ بھوکا ہے بابا پیسے دے دو " اس بار یہ صدا کچھ بدلی ہوئی تھی لیکن بچہ وہی تھا اور ہمیشہ کی طرح رو رہا تھا ۔ بابو لوگوں کی نظریں بھی شانتی کے نیم برہنہ جوان جسم پر گڑ گئیں ۔ گود میں روتا بچہ دیکھ کر بعض لوگوں نے شانتی کو جھولی میں پیسے ڈال دیئے لیکن بابو لوگوں کی نظریں اب بھی شانتی کے جوان جسم پر جمی ہوئی تھیں شانتی آج بہت خوش تھی اس کو روز سے زیادہ بھیک مل گئی پھر بھی وہ " بچہ بھوکا ہے بابا " کی صدائیں لگاتی وہاں گھوم رہی تھیں ۔ دو متجسس نگاہیں اس کا برابر تعاقب کر رہی تھیں ۔

پریس رپورٹر جو روز صبح یہاں آکر چائے پیتا تھا حیران تھا کہ شاردا کا بچہ شانتی کے پاس کیسے آگیا ۔ وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ دفتر کے بابو لوگوں کی ہڑتال کو چھوڑ کر وہ بچہ کی جستجو میں لگ گیا ۔ وقت گزرتا گیا پریس رپورٹر کی جستجو بڑھتی گئی ۔

ایک دن لوگوں نے اخبار کی سرخی دیکھی " ایک میٹرنٹی ہوم سے ننھے بچوں کا غائب ہوجانا ۔ ماں باپ کا رونا چلّانا ۔ میٹرنٹی ہوم کے مالک کے غیر قانونی کاروبار " ۔۔۔

○●○

"سفید گاڑی"

سورج کی تمازت ابھی بڑھی نہیں تھی لیکن صبح کی دھوپ کافی چمک دار تھی ۔ سڑک پر اسکول جانے والے بچوں کی چہل پہل بہت بڑھ گئی تھی ۔ اسکول کے رکشا ، آٹو رکشا ، بس ، اسکول کے کوچس سبھی دوڑے جارہے تھے ۔ ہر کوئی جلدی میں تھا ۔ یہ اس شہر کے روز کا معمول تھا ۔ وہ روز کی طرح آج بھی اپنے کندھوں پر کتابوں کا بوجھ اٹھائے اپنے گھر کی گلی پار کر کے سڑک پر آ کھڑا ہوا لیکن دور دور تک اس کی اسکول بس کا پتا نہ تھا ۔ وقت گزرا چلا جارہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی کہ اچانک ایک سفید گاڑی اس کے پاس آکر رکی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی کا بچھلا دورازہ کھلا اور لڑکا اندر کھینچ لیا گیا ۔ کھٹاخ سے دروازہ بند ہوا اور سفید گاڑی تیزی سے نکل گئی ۔ گاڑی کے کالے شیشے چڑھے ہوئے تھے ۔ گاڑی میں چار آدمی بیٹھے تھے ۔ دو اندر اور دو باہر ۔ لڑکا اندر کی سیٹ پر دو جوان آدمیوں کے بیچ جکڑا بیٹھا چیختا چلاتا رہا لیکن گاڑی کے

ڈیزل انجن کی آواز میں اس کی چیخیں دب گئیں ۔ گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی یہاں تک کہ وہ شہر کے حدود پار کر گئی ۔ لڑکا روتا چلاّتا رہا لیکن کوئی پرسانِ حال نہ تھا ۔ گاڑی دوڑی جارہی تھی ۔ لڑکا چھٹکارا پانے کی جدوجہد میں لگا تھا ۔ پھر گاڑی ایک گھنے جنگل میں غائب ہو گئی اور ایک طویل مسافت طئے کر کے ایک پرانی گیٹ پر رک گئی ۔گیٹ سے کافی فاصلے پر ایک بد رنگ سی عمارت کھڑی تھی جس پر " سپنا نرسنگ ہوم " کا مٹا مٹا بورڈ لٹک رہا تھا ۔ لڑکا یہ سب صرف گاڑی کی ونڈ اسکرین سے دیکھ سکا ۔ کیوں کہ اسے گاڑی کے چڑھے ہوئے کالے شیشوں سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا ۔ گاڑی کی اسٹیرنگ پر بیٹھے آدمی نے اندر ہی سے ایک سوئچ دبادیا اور گاڑی کے ریڈی ایٹر پر لگے چمکتے تارے سے ایک روشنی نکلی اور سپنا نرسنگ ہوم کی کھڑکی پر پڑی ۔ کھڑکی فوراً کھلی ۔ ادھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک آدمی گیٹ کھولنے کے لیے گاڑی سے نیچے اترا اور گیٹ کی طرف بڑھا لڑکا دوسرے آدمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گاڑی کے باہر کود پڑا اور بھاگنے لگا ۔ ساتھ ہی کار میں بیٹھا آدمی بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا ۔ پھر تین اور آدمی لڑکے کے تعاقب میں دوڑنے لگے ۔ لیکن لڑکا ان کی نظروں سے غائب ہوگیا ۔ ان نظروں سے جو چالاک بھی تھیں اور تجربہ کار بھی ۔ وقت نے ان ساری نظروں پر پردے ڈال دیئے تھے ۔ لڑکا ان کی نظروں سے اوجھل جھاڑیوں کے جھنڈ میں دبکا بیٹھا رہا ۔ وہ اسے ڈھونڈتے رہے ۔ سورج سر پر آگیا گرمی میں شدت پیدا ہوگئی لیکن لڑکا جھاڑیوں سے باہر نہ نکلا ۔ سوکھے پتوں کی چرچراہٹ بھی اسے خوف زدہ کردیتی لیکن اس نے

مستقبل مزاجی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا ۔ وہ چاروں آدمی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے اور اپنے نرسنگ ہوم لوٹ آئے ۔ جب لڑکے نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دیکھا کہ گاڑی نرسنگ ہوم کے اندر چلی گئی ہے وہ وہاں سے بھاگ نکلا ۔ جنگل گھنا تھا سڑک تک جانے کا راستہ ملنا مشکل تھا ۔ لڑکا چالاک تھا ۔ اس نے گاڑی کے پہیوں کے نشان تلاش کر لیے اور ان نشانوں کی راہ سے وہ سڑک کی طرف دوڑنے لگا وہ بہت تھک گیا ۔ اس کے قدم ڈگمگانے لگے ۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھتا ہی گیا ۔ ایک خوف ایک وحشت تھی جو اسے آگے لیے چلی جارہی تھی ۔ سورج اپنے منازل طے کرتا مغرب میں اتر رہا تھا ۔ لیکن لڑکا وقت اور فاصلے سے بے نیاز قدم اٹھائے جارہا تھا ۔ آخرکار جب وہ تھک کر گر پڑا تو سڑک اس کا نظارہ کر رہی تھی ۔

سورج غروب ہوچکا تھا ۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا ۔ لاریوں اور گاڑیوں کے گزرنے سے کچھ دیر سڑک پر روشنی رہتی پھر اندھیرا ۔ وہ سڑک کے قریب نڈھال پڑا تھا ۔ اسے ہوش بھی نہ تھا کہ اس کے کندھوں پر اس کی کتابوں کا بوجھ ہے ۔ پھر ایک نوجوان جوڑا جو اپنے فارم سے لوٹ رہا تھا ان کی کار کی روشنی لڑکے پر پڑی انھوں نے فوراً اپنی کار کو روکا ۔ دونوں کار سے اترے اور دیکھا کہ ایک لڑکا سڑک کے کنارے بے ہوش پڑا ہے ۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا انھوں نے فوراً لڑکے کو اٹھا کر اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور کار شہر کی سمت سڑک پر دوڑنے لگی ۔

شہر کے اسٹریٹ لائیٹ جل اٹھے تھے لڑکے کے ماں باپ پریشان تھے کہ لڑکا ابھی تک گھر نہیں آیا حالاں کہ گرما کا موسم تھا اور اسکول دوپہر کے تھے اور پھر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لڑکا بغیر اطلاع دیئے اتنی دیر تک گھر سے باہر رہا ہو۔ انھوں نے اسکول جاکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکا اسکول ہی نہیں آیا ہے۔ ان کی پریشانی اور بڑھ گئی پھر انھوں نے اپنے لڑکے کے ہر ایک دوست کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن لا حاصل۔ رات تاریک ہوتی جارہی تھی۔ ان کی پریشانی بڑھتی چلی جارہی تھی تاریکی انسان کو زیادہ بدحال اور پریشان کردیتی ہے۔ لڑکے کے ماں باپ دونوں بدحال و پریشان تھے۔ ان کی ہر تلاش ناکام ہورہی تھی۔ آخرکار انھوں نے پولیس کا سہارا لیا۔ پولیس نے بھی تلاش کرنے کا وعدہ کیا۔ حالاں کہ پولیس اس بات سے واقف تھی کہ کمسن لڑکوں کو شہر سے کون اٹھالے جاتا ہے۔ پولیس یہ جانتی تھی کہ یہ کام صرف سپنا نرسنگ ہوم والے ہی کرسکتے ہیں کیوں کہ سپنا نرسنگ ہوم کئی ایک غیر قانونی کاروبار میں ملوث تھا۔

کار شہر کی حدوں میں داخل ہورہی تھی۔ شام رات میں تبدیل ہوچکی تھی۔ شہر کی روشنیاں کار کا سواگت کررہی تھیں۔ نوجوان جوڑا پریشان تھا کہ لڑکے کا کیا کیاجائے۔ وہ دونوں بہت سمجھ دار تھے انھوں نے اپنی کار کو ایک بازو ٹھہرایا پھر لڑکے کے یونیفارم پر نظر ڈالی ان کی نظر اس کے یونیفارم پر لگے اسکول بیاج پر پڑی انھیں اسکول کا نام تو معلوم ہوگیا۔ لیکن یہ اسکول تھا کہاں انھیں معلوم نہ تھا۔ وہ دونوں سیدھے ٹیلیفون بوتھ پہنچے وہاں سے ٹیلیفون ڈائریکٹری نکالی اور اسکول کا پتا تلاش

کرنے لگے ۔ بوتھ پر روشنی کم تھی اور انھیں اسکول کا پتا تلاش کرنے میں
دقت ہورہی تھی بڑی مشکل سے اسکول کا پتا ملا ۔ کار تیزی سے اسکول کی
سمت روانہ ہوگئی ۔ رات کافی ہوچکی تھی ۔ اسکول کے قریب کے گھنٹہ
گھر نے بارہ بجائے اسکول کی گیٹ پر کار کا ہارن گونجا چوکیدار آنکھیں ملتا
اٹھا ۔ خاموشی میں کار کے ہارن کی آواز سے لڑکے کی آنکھیں کھل گئیں ۔
وہ کار کی سیٹ پر اٹھ بیٹھا وہ گم صم تھا ۔ تاریکی میں اسے کچھ سجھائی نہیں
دے رہا تھا ۔ چوکیدار کار کے قریب آیا ۔ نوجوان جوڑے نے لڑکے کو دکھا
کر اس کے گھر کا پتا دریافت کیا ۔ چوکیدار سارے معاملے کو سمجھ گیا لڑکے
کا غائب ہونا ماں باپ کا پریشان ہوکر لڑکے کے تعلق سے اسکول میں
دریافت کرنا ۔ کار ایک بار پھر لڑکے کے گھر کی سمت دوڑنے لگی ۔ لڑکے
کے ماں باپ دروازے پر آنکھ لگائے بیٹھے تھے ۔ دروازے پر کار کے
ہارن کی آواز سنائی دی ۔ ماں باپ دروازے کی طرف لپکے ۔ دروازہ کھولا ۔
لڑکا کار سے لڑکھڑاتا ہوا اترا وہ اب بھی گم صم تھا ۔ ماں باپ نے لڑکے کو
اپنے سینے سے لپٹالیا لیکن لڑکا بات کرنے کے قابل نہ تھا ۔ نوجون
جوڑے نے ساری داستان کہہ سنائی ۔ ماں باپ کی مسرت کی انتہا نہ تھی ۔
انھوں نے نوجوان جوڑے کا شکریہ ادا کیا ۔

لڑکا رات کو سوگیا وہ صبح بہت دیر سے اٹھا ۔ ماں باپ اس
کے ساتھ ساتھ لگے تھے ۔ اس نے معمول کے مطابق نہا دھو کر ناشتہ کیا
لیکن اب بھی وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھا ۔ ایک گہرے خوف سے وہ
گھٹا گھٹا رہتا اور اسکول جانے کے تصور ہی سے وہ کانپ جاتا ۔ اس کے

ذہن میں وہ سفید گاڑی گھوم رہی تھی ۔ اور زبان سے کوئی بات نہیں نکلتی تھی ۔

ایک ہفتہ یوں ہی بیت گیا ۔ لڑکے کے دوست احباب آتے اور دریافت کرتے اس کے ماں باپ کے عزیز و اقارب آتے دریافت کرتے لڑکے کی زبان سے صرف سفید گاڑی نکلتا اور اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہیں پاتا ۔

ایک دن لڑکے کے ماں باپ نے اخبار میں ایک عبرت ناک خبر پڑھی " شہر میں سفید گاڑی کا گھومنا کمسن لڑکوں کا غائب ہونا ۔ ہونہار بچوں کے اعضا کے غیر قانونی کاروبار ۔ ۔ ۔"

○●○

میرے نواسے میر افتخار حسین سلمہٗ نے یہ تصویر صرف چار برس کی عمر میں کھینچی ہے

(وسیم)

وسیم عباس حیدرآباد کے ایک مشہور کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کو ادب و شعر کا ذوق اپنے خاندان سے ملا ہے۔ ان کے نانا نے علامتی شاعری اس وقت کی جب کہ خود "علامتی" کا لفظ اردو ادب میں مروج نہیں ہوا تھا یعنی آج سے سو، سوا سو سال پہلے۔ یہی تخلیقی جوہر ان کے مزاج میں شامل ہوگیا ہے۔ وسیم عباس اس وقت سے کہانیاں لکھ رہے ہیں جب وہ صرف ساتویں جماعت میں تھے۔ ان کے زیرِ نظر افسانوں کے مجموعہ کا عنوان "حیات کا رقص" ہے۔ یہ صرف برائے نام رقصِ حیات نہیں بلکہ حقیقت میں بھی انھوں نے اپنے اکثر افسانوں میں زندگی کی بساطِ رقص پیش کی ہے۔ یوں انھوں نے افسانے کو حقیقت بنادیا ہے اور حقیقت، افسانہ بن گئی ہے۔ جب کوئی افسانہ نگار ایسا کرتا ہے تو اس کی افسانہ نگاری کس قدر دل چسپ اور خوب صورت ہوسکتی ہے۔ اس کا اندازہ میرے کہنے پر نہیں بلکہ خود افسانوں کے مطالعہ کے بعد آپ کرسکتے ہیں۔ یہاں "زندگی کی کتاب" کا ایک "ورق" پیش کیا جاتا ہے:

"ایک دن جب وہ انگریزی رسالے کے سوال / جواب کا کالم پڑھ رہا تھا۔ اس کی نظر ایک سوال پر رک گئی۔ سوال تھا:

ARE EXAMINATIONS REALLY A TEST OF MERIT

اور اس کا جواب تھا:

IT IS A MILE STONE WHERE IDIOT STOPS LEARNING.

ڈاکٹر یوسف سرمست

ریٹائرڈ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو
جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد۔

وسیم عباس